26/12

صحابہ کرامؓ کا ادب

حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان کا ادب واحترام از حد ضروری ہے کیونکہ ان کے توسط سے ہی ہم تک دین پہنچا ہے۔ اس لیے ان کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ تعالٰی علیہ واصحابہ وسلم کا ارشاد ہے جس نے ان سے محبت کی تو میری محبت کے ساتھ ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو میرے بغض کے ساتھ ان سے بغض رکھا اور جس نے ان کو ایذا پہنچائی اس نے مجھے ایذا پہنچائی اور جس نے مجھے ایذا پہنچائی اس نے اللہ تعالٰی کو ایذا پہنچائی اور جو اللہ تعالٰی کو ایذا پہنچانا چاہے تو قریب ہے کہ اللہ تعالٰی اس کو عذاب میں پکڑ لے۔ (حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ۔ جمع الفوائد ص۲۹۱ جلد دوم)

احادیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم
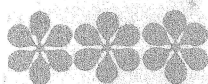
محمد سعید الرحمٰن علوی

امتِ مسلمہ کی خیریت

قال حمید بن عبدالرحمٰن سَمِعْتُ مُعَاوِيَةَ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) خَطِيبًا يَقُولُ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صلی اللہ تعالیٰ علیہ واصحابہ وسلم يَقُولُ مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ وَ إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِي وَلَنْ تَزَالَ هٰذِهِ الْأُمَّةُ قَائِمَةً عَلٰى أَمْرِ اللّٰهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ۔

(بخاری ص۱۶ ج ۱)

ترجمہ: حضرت حمید بن عبدالرحمٰن رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خطبہ کی حالت میں سنا کہ آپ فرماتے تھے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و اصحابہ وسلم سے میں نے سنا آپؐ ارشاد فرماتے تھے کہ جس شخص کے حق میں اللہ تعالیٰ بہتری و بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اسے دین کی سمجھ عطا فرماتے ہیں۔ اور فرمایا کہ میں قاسم ہوں معطی اللہ تعالیٰ ہیں۔ اور یہ امت ہمیشہ اللہ کے دین پر قائم رہے گی۔ جو لوگ اس کی مخالفت کریں گے وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ کا امر" آ جائے۔

اس روایت کے دو حصوں یعنی "من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین" اور "انما انا قاسم واللہ یعطی" کے متعلق کسی قدر گذارشات اس سے پہلے پیش کی جا چکی ہیں۔ محولہ بالا حدیث کے آخری حصہ کے متعلق یہاں سرسری گذارشات پیشِ خدمت ہیں۔

اس آخری حصہ حدیث میں امت مسلمہ کی خیریت، اس کے حق پر قائم رہنے اور مخالفین و حاسدین کے شر و فتن سے محفوظ رہنے کی خبر ہے۔ بعض روایات میں کچھ اس قسم کے الفاظ ہیں جن کا مفہوم ہے "میری امت میں ایک طبقہ حق پر قائم رہے گا۔"

ہر نبی سمیت سرکار دو عالم علیہ السلام کی امت میں بھی باہمی اختلاف و افتراق کا سلسلہ موجود ہے جس کی خود آپ نے خبر دی۔

پہلے تو آپ نے بنی اسرائیل کی تفرقہ بازی کا ذکر فرمایا اور پھر اس طرف توجہ دلائی کہ میری امت میں بھی ایسا ہوگا بلکہ ان سے کسی قدر بڑھ کر۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام فرقے اور ان میں شامل لوگ دعوے کی حد تک یہی کہتے تھے اور کہتے ہیں کہ ہم آپ کی امت ہیں لیکن سرورِ کائنات علیہ السلام نے ان میں سے صرف ایک فرقہ و جماعت کے نجات یافتہ ہونے کی خبر دی اور فرمایا کہ باقی سب جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ وہ ایک جماعت جو نجات پائے گی اس کی شناخت و پہچان کے لیے فرمایا مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي (میرے اور میرے صحابہؓ کی راہ پر چلنے والے لوگ ناجی ہوں گے) گویا جو جماعت صبح قیامت تک حق سے وابستہ رہے گی اور اس کا اوڑھنا بچھونا حق اور دین اسلام ہوگا وہی طبقہ اور جماعت ہے جس کی مذکورہ بالا حدیث میں خبر دی گئی۔

اللہ کے نبی کا فرمان سو فی صد درست اور صحیح اور

(باقی ۹ پر)

جلد ۲۶ ؛ شمارہ ۱۲

۸ ذیقعدہ ۱۴۰۰ھ ؛ ۲۰ ستمبر ۱۹۸۰ء

اس شمارہ میں

رئیس الادارہ

پیر طریقت حضرت مولانا عبید اللہ انور مدظلہ

مدیر منتظم : میاں محمد اجمل قادری

مدیر : محمد سعید الرحمٰن علوی

بدل اشتراک	سالانہ -/۶۰ روپے ، ششماہی -/۳۰ روپے
	سہ ماہی -/۱۵ روپے ، فی پرچہ ۵۰/۱ پیسہ

ترکی میں

فوجی انقلاب

ترکی عالم اسلام کا ایک ایسا ملک ہے۔ جس سے برصغیر پاکستان وہندوستان کے مسلمانوں کو انتہائی جذباتی تعلق ہے۔

پہلی عالمی جنگ کے موقع پر ترکی سلطان عبد الحمید کی خلافت کے باوصف مردِ بیمار کہلاتا تھا۔ اور اس پر غیر ملکی غلامی کے منحوس سائے منڈلانے لگے تھے۔ لیکن اسی ابتلاء کے دور میں غازی مصطفےٰ کمال کی صورت میں قدرت نے ایک ایسا مردِ مجاہد پیدا کیا۔ جس نے ترکی کو مردِ بیمار کے بجائے مردِ آہن بنا دیا۔ اور بیمار خلافت، اگرچہ وفات پا گئی۔ لیکن ترکی نے ایک طاقتور مملکت کی حیثیت سے غیر مسلم حریفوں سے اپنا لوہا منوالیا۔ لیکن اس تعمیر میں ایک خرابی ایسی رہ گئی جس کے باعث ترکی ایک مسلم مملکت تو رہا لیکن اسلامی ریاست نہ بن سکا یہی سبب ہے کہ مصطفےٰ کمال کے انتقال کے بعد سے وہاں کوئی مستحکم حکومت قائم نہ ہو سکی۔ اور اب گذشتہ کئی برسوں سے وہ غیر یقینی حالات کا شکار چلا آرہا ہے

اس ہفتے ترکی میں جو فوجی انقلاب آیا ہے۔ وہ خلافِ توقع نہیں۔ کیونکہ گذشتہ پانچ برس سے وہاں سیاسی قتل و غارت کا سلسلہ جاری تھا۔ اور امن وامان اور نظم ونسق کی حالت درہم برہم ہو چکی تھی۔ نئے فوجی انقلاب کے بعد ترکی پارلیمنٹ بھی توڑ دی گئی ہے۔ اور آئین بھی منسوخ کر دیا گیا ہے۔ نیز سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا کر سابق وزیر اعظم سلیمان دیمرل اور قائدِ حزب اختلاف بلند ایجوت سمیت متعدد سیاسی رہنماؤں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو حراست میں لے لیا گیا ہے

اگرچہ ترکی کے نئے فوجی حکمرانوں نے ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر مناسب وقت پر جمہوریت بحال کرنے کا عزم ظاہر کیا ہے۔ لیکن فی الحال اس عزم کی تکمیل آسان دکھائی نہیں دے رہی۔ بہر صورت ترکی میں اس صورتِ حال سے اسلامی ملکوں میں تشویش کی لہر دوڑ جانا قدرتی امر ہے اور پاکستان کے عوام کو بھی اس صورتِ حال سے پریشانی لاحق ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ترکی کے فوجی حکمران صورتِ حال پر جلد تر قابو پالیں اور وہاں صحیح معنوں میں اسلامی جمہوری نظام قائم ہو سکے۔ جس کی عالمِ اسلام کے تمام ملکوں میں واقعی ضرورت ہے۔ اور جس کے نفاذ کے بغیر اسلامی دنیا کے مسائل ہرگز حل نہیں ہو سکتے۔

حبیبؔ، اسلامپوری

طیبہ کی نورانی گلیوں میں کیا عجب نظارے ہوتے ہیں
افلاک سے جاری مولا کی رحمت کے نظارے ہوتے ہیں

دن رات زیارت کی خاطر آتے ہیں فرشتے روضہ پر
پھر صلِ علیٰ کے نغموں سے معمور نظارے ہوتے ہیں

سینوں سے لگاتے جاتے ہیں وہ پیاری پیاری جالی کو
عشاق کی پلکوں پہ اکثر اشکوں کے ستارے ہوتے ہیں

سرکارِ مدینہ صلِ علیٰ، یٰسین و مزمل اور طہٰ
قرآن میں ذکرِ احمد پر فطرت کے اشارے ہوتے ہیں

محبوبِ خدا کے دیوانے بس پیار کی دولت رکھتے ہیں
مولا کے پیارے بنتے ہیں، جو اُن کے پیارے ہوتے ہیں

رکھتے ہیں حبیبؔ تمنا یہی موت آئے تو آئے مدینے میں
فرقت میں تڑپنے والوں کو یادوں کے سہارے ہوتے ہیں

مجلسِ ذکر

ضبط و ترتیب : علوی

اچھوں کی ہمنشینی

پیر طریقت حضرت مولانا عبیداللہ انور دامت برکاتہم العالی

بعد از خطبہ مسنونہ :۔

محترم حضرات ! اللہ تعالیٰ نے قرآن عزیز میں اہل تقویٰ و صلاح کی رفاقت و معیت اختیار کرنے کا ایمان والوں کو حکم دیا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے۔" اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور متقی لوگوں کی رفاقت و معیت اختیار کرو۔"

اچھے لوگوں کی رفاقت و معیت اختیار کرنے میں مصلحت یہ ہے کہ ان کی نیکی اور خیر و صلاح کا اثر انسان پر پڑیگا۔ اور وہ انشاء اللہ تعالیٰ اسی رنگ میں رنگا جائے گا۔ اس کے برعکس بری سوسائٹی اور بری محفل اختیار کرنے اور برے لوگوں کی رفاقت اپنانے سے انسان خواہی نخواہی برائیوں کا شکار ہوگا۔ احادیث میں اس کی مثال اس طرح دی گئی ہے کہ اچھوں کی رفاقت ایسے ہے جیسے کسی آدمی کا عطار کی دکان پہ اٹھنا بیٹھنا ہوگا۔ اگر وہ عطر حاصل نہیں کرے گا تو بھی اس کی خوشبو سے محروم نہیں رہے گا۔ جب کہ بروں کا ہم نشین ایسے ہے جیسے لوہار کی بھٹی کہ وہاں بیٹھ کر آدمی آگ کے نقصان سے کسی نہ کسی طرح ضرور متاثر ہوگا۔ کسی عارف نے بڑے اچھے انداز میں اچھے اور نیک لوگوں کی ہم نشینی اور فوائد کی طرف توجہ دلائی ؎

صحبتِ صالح ترا صالح کند
صحبتِ طالع ترا طالع کند

اور اسی مضمون کو پنجابی میں یوں دہرایا گیا ہے ؎

چنگیاں دے لڑ لگیاں میری جھولی پھُل پئے
ننے منڈیاں دے لڑ لگیاں میرے اگلے بھی ڈُل گئے

سو اللہ کا حکم کہ اچھوں کی رفاقت اختیار کرو، انسانوں کی بھلائی کی خاطر ہے۔ کیونکہ اللہ کے ہر حکم میں بندوں کا ہی فائدہ ہے وہ ذات جس نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا وہ ہر معاملہ میں اپنے بندوں کے فوائد کے مطابق حکم دیتی ہے۔ اچھے لوگ کون ہیں؟ یہ ایک اہم

خاص طور پر اس دور میں یہ مسئلہ اور ہی نازک صورت اختیار کر گیا ہے۔ سرکار دو عالم علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ کے مخلص اور نیک بندے وہ ہیں کہ ان کی مجلس میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں پیدا ہو۔ جس آدمی کا ظاہر و باطن یکساں ہوگا اور اس کا دل اللہ کی یاد سے منور ہوگا، اس کی محفل میں دین کی باتیں ہوں گی اس کے چہرہ کو دیکھ کر اللہ یاد آئے گا۔ اس کے منہ سے کوئی لغو اور فضول بات نہیں نکلے گی اس کا اوڑھنا بچھونا اللہ کا دین ہوگا اور وہ لوگوں کو اسی رنگ میں رنگنے کے لیے سرگرم ہوگا۔ اس کے برخلاف جن لوگوں کے ظاہر و باطن میں تضاد ہوتا ہے۔ سنتِ رسولؐ کی روشنی سے جو لوگ محروم ہوتے ہیں، جن کی زندگیاں بدعات اور شرکیہ رسومات کا ملغوبہ ہوتی ہیں ان کی محفلوں میں ایک طرح کی

ظلمت اور نحوست محسوس ہوتی ہے ان کی محفل میں دُور از کار اور فضول باتیں بہت ہوتی ہیں لیکن خدا خوفی، عبادت و بندگی، ذکر و فکر کی تلقین قطعاً نہیں ہوتی۔

یہ ایک موٹا سا اصول ہے جس کی طرف کائنات کے سب سے بڑے مربی جسے انسانوں کی تربیت کے لیے خود خالقِ کائنات نے بھیجا تھا ارشاد فرمایا کہ اہل اللہ وہ ہیں جنہیں دیکھ کر خدا یاد آئے۔

سرورِ کائنات ؐ کے وہ سچے خادم اور اللہ کے نیک بندے جنہوں نے انسانوں کی اصلاح باطن کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ ان کے حالات زندگی پر کتابیں جب پڑھی جاتی ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ کیسے کیسے باخدا لوگ ہو گزرے ہیں۔ ہمارے سلسلے کے شیخ المشائخ حضرت سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کی محفل میں ہزاروں ہزار لوگ شریک ہوتے اور آپ کے پُردرد اور پُراثر وعظ سے تائب و ذاکر بن جاتے اسی طرح برصغیر میں حضرات چشتیہ کے شیخ المشائخ خواجہ اجمیری قدس سرہٗ کے تذکروں میں ان کے کمالات کا تفصیلی ذکر ہے کہ کس طرح انہوں نے تن تنہا کفر آباد میں توحید ربانی کی مشعل جلائی۔ علیٰ ہذا القیاس ــــ اس دھرتی پر اللہ کے ہزاروں بندے تھے جنہوں نے اپنے ظاہر و باطن کو صبغۃ اللہ کے رنگ میں رنگ کر دین اسلام کی آبیاری کی اور اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں گو کہ انحطاط کے سبب کم ہیں تاہم معدوم نہیں لیکن سوچ سمجھ کر اور پوری تلاش کے بعد کسی مرد صالح سے رابطہ کرنا چاہیئے اور پھر کمال ادب سے اس کی تعلیمات کی روشنی میں "سرگرم سفر ہونا چاہیئے۔ کہ اس میں کامیابی اور نجات ہے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین!

بقیہ: احادیث الرسولؐ

ہمارا ایمان ہے کہ اس جماعت کا تسلسل کبھی نہیں ٹوٹا۔ ہمیشہ اللہ کے ایسے بندے دنیا میں رہے جو اللہ کی راہ میں ایثار و قربانی کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔ اور ایسی جماعت آج بھی موجود ہے۔ یہی جماعت ہے جسے حدیث میں "سوادِ اعظم" کا نام دے کر اس کے اتباع کی تلقین کی گئی۔ کیونکہ "سوادِ اعظم" انسانی بھیڑ کا نام نہیں بلکہ ارباب صدق و صفا کا نام ہے چاہے وہ تعداد میں تھوڑے ہوں۔ اور قرآن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ "تھوڑا ہونا" کوئی عیب نہیں، اور زیادہ ہونا حق کی دلیل نہیں۔ تاریخی نقطۂ نظر سے اس جماعت کے تسلسل پر گفتگو ہمارا مقصد نہیں کہ اس سے بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ تاہم یہ واقعہ ہے جیسا کہ عرض کیا کہ یہ تسلسل کبھی متاثر نہیں ہوا۔ رہ گئی یہ بات کہ مخالفین و حاسدین کی ریشہ دوانیاں اس جماعت کو نقصان نہیں پہنچا سکیں گی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جماعت فنا نہیں ہوگی اس کا وجود ہستی سے مٹے گا نہیں لیکن جہاں تک تکالیف و مصائب کا تعلق ہے وہ ایک الگ بات ہے۔ اہل حق و صداقت پر تکالیف کا ہجوم کوئی انہونی بات نہیں۔ قرآن عزیز اس بات سے بھرا پڑا ہے اور سرور کائنات کے ارشادات بھی ان گنت ہیں۔ یہ تکالیف و مصائب "یمحص اللہ الذین آمنوا" کے ضمن میں آتی ہیں یعنی اس سے اہل حق کو مزید نکھار اور جلا نصیب ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس گروہ مقدسہ کی رفاقت سے ہمیں نوازے۔

خطبہ جمعہ

ترتیب : مولانا عبدالرؤف فاروقی

حضرت حمزہؓ کو دربارِ رسالتؐ سے سیّد الشہداء کا تمغۂ امتیاز عطا ہوا

○ جانشین شیخ التفسیر حضرۃ مولانا عُبَیداللہ انور مدظلہم ○

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الّذین اصطفیٰ، خصوصًا علیٰ سیّد الرّسل وخاتم الانبیاء، امّا بعد: فاعوذ باللہ من الشّیطٰن الرّجیم: بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم :—

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ، بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔ صدق اللہ العظیم۔

محترم حضرات! سیدنا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی سیرت کے سلسلہ میں گذشتہ خطبہ میں مختصراً یہ بیان ہوا کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی نگاہ میں حضرت حمزہؓ بڑی عظمت کے حامل تھے اور جس طرح جرأت و پامردی سے انہوں نے ہر میدان میں اللہ کی رضا کے لیے کافروں کا مقابلہ کیا اور اسلام کے سپاہی کی حیثیت سے اسلام کا پرچم بلند رکھنے کے لیے جو مجاہدانہ کارنامے سرانجام دیئے ان کی بناء پر سیّد الکونین، رسول الثقلین، امام الانبیاء حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو "اَسَدُ اللہِ وَ اَسَدُ رَسُوْلِہٖ" (یعنی اللہ کا شیر اور اللہ کے رسولؐ کا شیر) کا لقب عطا فرمایا۔

حقیقت یہ ہے کہ جنگ اُحد میں سیدنا حضرت حمزہؓ نے دربارِ نبوّت سے ملنے والے اس لقب کا صحیح مصداق بن کر دکھایا۔ آپؓ اللہ تعالیٰ کے غضب اور جلال کی بجلی بن کر مشرکین مکّہ پہ ٹوٹ پڑے۔ آپؓ کی تلوار بہت سے کافروں کے لئے پیغامِ اجل بنی اور آپؓ دونوں ہاتھوں میں لی ہوئی تلواریں چلاتے کافروں کی صفوں میں گھس گئے اور صفوں کی صفیں اُلٹ دیں۔

شہادت

حضرات! گذشتہ جمعہ میں یہ بھی بیان ہوا کہ بدر کے معرکہ میں حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں قریش کے کئی سردار جہنم واصل ہو چکے تھے۔ چنانچہ اُحد میں آنے سے پہلے ہی اُن کے ورثاء نے حضرت حمزہؓ کو شہید کرکے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کا پروگرام بنا لیا تھا اور اس کے لیے وحشی بن حرب ایک غلام کو حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے کے بدلہ میں آزاد کر دینے کا لالچ دیا گیا اور وہ آزادی کی نعمت کو حاصل کرنے کے لیے یہ کام کرنے پہ آمادہ ہو گیا۔ میدانِ اُحد میں ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں چھپ کر اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ حضرت حمزہؓ یہاں سے گذریں تو اچانک حملہ کیا جائے۔ حضرت حمزہ کافروں پہ ضرب کاری لگاتے ہوئے جب اُس پتھر کے پاس سے گذرے تو اُس نے اپنی زد میں پاکر حبشیوں کا خاص ہتھیار حربہ (چھوٹا نیزہ) آپؓ پہ اچانک پھینکا جو آپؓ کی ناف کے قریب جا کر لگا۔ وار کاری ثابت ہؤا اور خون کا ایک فوارہ پیٹ سے چھوٹ نکلا۔ آپؓ چکرا کر گر پڑے اور فوراً جامِ شہادت نوش کرکے منزل مراد تک پہنچ گئے۔ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی

مالکِ حقیقی کے روبرو حاضر ہوئی۔ اور سرخرو ہو کر جنت میں پہنچ گئی جو شہداء کا اصلی ٹھکانہ ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ شہداء کی روحوں کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے جنت میں سبز پرندوں کا وجود دیا جاتا ہے۔ اور وہ جنت میں آزادانہ اُڑتے اور سیر کرتے رہتے ہیں۔

محترم حضرات! ایک مسلمان کی حیثیت سے آپ کو بخوبی علم ہے کہ جنگ اُحد میں ابتدائی طور پر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور کفار شکست خوردہ ہو کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن جب مسلمان مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہوتے اور پہاڑی درے میں متعین پچاس سپاہیوں کے دستے نے بھی اُن کے ساتھ مل جانا مناسب سمجھا تو راستہ خالی پا کر خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابوجہل (جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) نے پلٹ کر مالِ غنیمت اکٹھا کرنے میں مصروف مسلمانوں پر عقب سے اچانک حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ مسلمان سنبھل نہ سکے۔ ہتھیار اٹھانے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ ایک بھگدڑ سی مچ گئی اور اپنے ساتھیوں کو پہچاننا بھی مشکل ہو گیا۔ اس طرح کفار نے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ستر صحابہ کرامؓ شہید ہوئے۔ بہت سے زخمی ہوتے، اور خود رحمتِ کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شدید زخمی ہوئے، دانت شہید ہوئے اور آپؐ پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک گڑھے میں گر پڑے تو کافروں نے اعلان کر دیا کہ (العیاذ باللہ) "اَلَا اَنَّ مُحَمَّدًا قَدْ قُتِلَ" کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل کر دئے گئے۔ اس اعلان سے مسلمانوں کے حواس جاتے رہے اور عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی لیکن جب کبار صحابہؓ نے کمال جرأت مندی کے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے کھڑے ہو کر تیروں کے وار برداشت کئے اور آپؐ کو لے کر محفوظ مقام پر پہنچ گئے تو کافر خوشی کے ساتھ واپس ہو گئے کہ بدر کا انتقام پورا ہو گیا تھا۔ حالات جب کافی حد تک سنبھل گئے تو آپؐ زخمیوں اور شہیدوں کی خبر لینے کے لیے میدان میں تشریف لائے یہ وقت حضور علیہ السلام کے لیے بڑا سخت وقت تھا کہ آپؐ کے ستر صحابہ کرام کی لاشیں میدانِ اُحد میں بکھری پڑی تھیں زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی اور شہداء کی لاشوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا گیا۔

سید الشہداء کا اعزاز

محترم حضرات! اس درمیانی وقفہ میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کی بے حرمتی ہوئی اور ہندہ نامی ایک عورت نے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے آپؓ کے کان، ناک اور ہونٹ وغیرہ اعضاء کاٹ کر ان کا ہار بنا کر اپنے گلے میں ڈالا۔ سینہ چاک کر کے جگر نکالا اُسے چبایا، نگل نہ سکی تو تھوک دیا اس طرح جب حضرت حمزہؓ کی لاش کو حضور علیہ السلام نے دیکھا تو ضبط نہ کر سکے۔ اسی موقع پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت حمزہؓ کو سید الشہداء کا تمغہ امتیاز عطا فرمایا۔

محترم حضرات! اب جنگ اُحد سے پہلے یا بعد جو مسلمان بھی اسلام کی عظمت کے لیے خدا تعالیٰ کو راضی کرتے ہوئے اپنی جان قربان کرے گا وہ شہید ہے لیکن سید الشہداء صرف اور صرف حضرت حمزہؓ ہیں کہ دربارِ نبوت سے یہ اعزاز آپؓ کو ملا ہے اب یہ تمغہ چھین کر کسی اور کو دینا اور حضرت حمزہؓ کے لیے زبانِ رسالت سے استعمال ہونے والی اصطلاح کسی دوسرے کے لیے استعمال کرنا شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً جرم بھی ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فیصلوں کی توہین بھی۔ اس لیے ہمارا موقف ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی طرف سے جاری ہونے والی ان مقدس اصطلاحات میں

(باقی ۱۱ پر)

محسنِ انسانیت

لال دین انگر، ایم اے۔ بی ٹی

پروردگارِ عالم نے تمام مخلوقات میں انسان کو ان ملکاتِ روحانیہ اور کمالاتِ جسمانیہ سے نوازا ہے کہ یہی چیزیں اس کی شرافتِ عظمیٰ کی دلیل ہیں۔ اس کے خمیر میں فرشتوں کا سا ذوقِ عبادت موجود ہے۔ اور خلافتِ کبریٰ (جہانگیری) کے جوہر بھی پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر ملائکہ عظام سے بھی زیادہ فرائض عائد کیے گئے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام اور اولادِ آدمؑ کا یہ شرف باقی مخلوقاتِ ارضی و سماوی کے اعتبار سے ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سب سے بڑی فضیلت انبیاء کرام کے گروہ کو مرحمت فرمائی ہے۔ چونکہ ہر زمانے میں عادۃ اللہ یہی رہی ہے کہ اس وقت کے تقاضوں کے مطابق رشد و ہدایت کے علمبردار الٰہی قوتوں سے مسلح ہو کر مختلف قوموں کے سامنے خدائے برتر کی خوشنودی حاصل کرنے کا پروگرام پیش کرتے آئے ہیں۔ لہٰذا ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم و بیش ہادیانِ برحق نے مختلف وقتوں میں احکم الحاکمین کے فرامین کو اہلِ دنیا کے سامنے پیش کیا۔

کائناتِ ارضی کی آبادی چونکہ علاقائی امتیازات اور زبانوں کے اختلافات کی بنا پر مختلف بستیوں میں بٹی ہوئی ہے اس لیے خدائے لم یزل کی طرف سے ان بستیوں کے ام القریٰ میں سفراء حق آتے رہے۔ اور یہ سلسلۂ نبوت و رسالت رسولِ انس و جان صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک بعثت تک جاری رہا۔ خداوندِ قدوس نے قرآنِ حکیم میں اس حقیقت کو آیاتِ بینات سے واضح کر دیا ہے کہ رسولِ ہاشمیؐ تمام روئے زمین کی قوموں، نسلوں اور قیامت تک کی تمام جن و انس کی آبادیوں کے لیے آخری ہادی ہیں۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ۔ خالقِ اکبر نے آپ کو سید الاولین والآخرین بنا کر بھیجا ہے آپ کا وجودِ پاک نبوت و رسالت کے تمام کمالات کا مظہرِ اتم ہے۔ سیرت کا ایک ایک باب اور اس حیاتِ طیبہ کا ہر ایک لمحہ اس حقیقت کا شاہد ہے کہ آپ کا ظہورِ قدسی انبیاء سابقین کے انوار کا جامع ہے۔ اس جگہ سیدنا نوح علیہ السلام سے بڑھ کر تبلیغی ولولے موجود۔ ابراہیم علیہ السلام کی مسلمانہ استقامت، ذبیح اللہؑ کی تسلیم و رضا، حضرت ایوب علیہ السلام کا صبر و تحمل، کلیم اللہؑ سے بڑھ کر حسنِ تکلم اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ مسیحائی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ یہاں حسنِ یوسف بھی ہے اور لحنِ داؤدی بھی ہے۔ دراصل ربّ العزت نے تمام مخلوقات میں جامعیت کا تاج آپؐ کے ہی فرقِ اقدس پر رکھا ہے۔ ؎

اے کہ بر تختِ سیادت ز ازل جا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اکثر انبیاء کرام نے آپ کی آمد کی پیشین گوئیاں بیان فرمائی ہیں۔

بحیرہ راہب نے آپ کو کم سنی میں ابو طالب کی معیت میں تورات و انجیل کی بشارات کے مطابق پہچان لیا تھا۔ خالقِ ارض و سما نے آپ کی رحمت آثار نبوت کو تمام عالمیانِ ارض و سما کے لیے رحمت و رافت بنایا ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

اسی ہمہ گیر رحمت کو علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے بایں الفاظ پیش کیا ہے۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بُدے
رحمۃ للعالمینے ہم بُدے

اسی مناسبت سے آپ پر نازل شدہ کتابِ مبین بھی تمام مستقبلہ ادوار کے مقتضیات کو پورا کرنے والی ہے۔ وہ توحید و رسالت کے دلائل میں بے مثل ہے۔ وہ عبادات و معاملات کے تمام پہلوؤں میں آسمانی رہنمائی کی علمبردار ہے۔ وہ اخلاقیات و معاشیات کے آداب میں بے بدل حقیقت کی حامل ہے اس میں معاشرتی اور تمدنی زندگی کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مادی ترقی کے اسباب سے مکمل آشنا کرتی ہے یہ روحانیت کی راہوں میں قدم قدم پر اصلاحِ احوال اور تزکیۂ ارواح کے ابدی چراغ روشن کرتی ہے۔ یہ فقر و شاہنشاہی کی جامعیت پر زور دیتی ہے۔ ؎

خسروی شمشیر و درویشی نگاہ
ہر دو گوہر از محیطِ لا الٰہ
فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰ است
ایں تجلیہائے ذاتِ مصطفیٰ است

یہ دین و سیاست کی جدائی کو کفر سے بدتر سمجھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ اکمل دین و سیاست کے توام انوار کا ایک مرقعۂ بے نظیر ہے۔ شاعرِ مشرق نے قرآنِ حکیم کی اسی روشن حقیقت کو تمام مسیحی دنیا کے سامنے نہایت فخر سے پیش کیا ہے۔ ؎

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری

قرآنی تعلیمات نے بندہ و آقا کے تباہ کن امتیازات کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ وہ نسلوں کے امتیاز، علاقوں کے تفاوت، کنبوں کی برتری کو اسلام کی صف پر لاکر اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کا پیغام مساوات دیتی ہیں۔ ؎

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا قرآنِ حکیم ہی تو ہے جو معاشرے کے خاکروب سے لے کر کجکلاہِ سلطنت کے لیے مکمل ضابطۂ حیات رکھتا ہے۔ سابقہ شریعتوں کا نچوڑ اور آسمانی صحائف کا خلاصہ قرآن کریم کے آئینے میں نظر آتا ہے۔ پہلی قوموں کی عادات مذاہب اور رسم و رواج کی ایک نہایت جامع تاریخ پیش کرتا ہے۔ وہ نافرمانوں کے انجامِ بد اور صالحین کی ابدی کامیابی کا پتہ دیتا ہے۔ وہ اوامر و نواہی اور ابلاغِ حق کے احسن اسالیب پیش کرتا ہے قرآنِ حمید اس جامع صفات دین کا ترجمان ہے۔ جس کا اعلان ایزد متعال نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خدام کو مخاطب کرکے فرمایا ہے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

(اے رسولِ ہاشمی کے خادمو! ہم نے تمہارے دین کو ہر لحاظ سے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو تم پر پورا کر دیا ہے۔ اور میں تم کو کالی کملی والے محبوب کے سامنے خادمانہ سر جھکائے دیکھ کر ہر طرح سے خوش ہوں)

آپ کا جسمانی معراج کا بابرکت واقعہ اور پھر بیت المقدس کی سعادتوں سے بھری ہوئی سرزمین میں آپ کا تمام انبیاء کرام کی امامت کے فرائض کو ادا کرنا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ آپ کی ذاتِ گرامی ہی سیدِ دو عالم ہے۔ ؎

محمدِ عربی کآبروئے ہر دو سرا
ہر آنکہ خاکِ درش نیست خاک بر سرِ او

مناسکِ حج میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا مقامِ خلّت، اسماعیل علیہ السلام کی اطاعت و انقیاد، امّاں ہاجرہ کی دیوانہ وار جان نثاریاں، اور سیدنا آدم علیہ السلام کی توبہ و انابت کی عاجزانہ کیفیتیں اگر اپنی پوری ہم آہنگی سے ایک دل میں اور ایک روح پر مسلّط نظر آتی ہیں تو محمدِ مصطفیٰ کا قلبِ اطہر اور خاتم الانبیاء کی روحِ پاک ہے۔ شق القمر کے معجزہ کے شرف و مجد سے تمام کائنات پر یہ اتمامِ حجت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی وسعت تحت الثریٰ سے فلک الافلاک تک پھیلی ہوئی ہے۔

آپ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی دلیل ہے۔ آپ کا دین تمام ادیانِ سابقہ کا ناسخ ہے۔ آپ کی امت آخری امت ہے اور خیر الامم کے مبارک لقب سے ملقب ہے۔

آدم وَمَا دُوْنَہٗ تحت لوائی آپ کی سیادت کا نشان ہے۔ ایک موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا، تمام انبیاء علیہم السلام پر مجھ کو چھ باتوں میں خصوصی فضیلت دی گئی۔ مجھ کو ایسا کلام عطا کیا گیا کہ جس کے الفاظ تھوڑے اور معانی زیادہ ہیں۔ مجھ کو مرسلانہ رعب و جلال سے نوازا گیا۔ مالِ غنیمت میرے لیے

حلال کیا گیا۔ تمام روئے زمین کو میرے لیے سجد بنایا گیا، مجھے تمام (جن و انس، شجر و حجر وغیرہ) کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا۔ اور مجھ پر ہی تمام انبیاء (کی تشریف آوری) و پیدائش کو ختم کر دیا گیا۔ اُرْسِلْتُ اِلَی الْخَلْقِ کَافَّۃً وَّخُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ (مسلم)

یہ اور اس قسم کے ہزاروں نہیں لاکھوں دلائل و شواہد ہیں۔ جن کی روشنی میں ایک صاحب ایمان بیانگِ دُہل کہہ سکتا ہے کہ عبداللہ کے دُرِّ یتیم اور آمنہ کے لال کا مثیل اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں ہرگز ہرگز نہیں۔ قیامت کے دن شفاعتِ کبریٰ کا اعزاز بھی آپ کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ اللہ! اللہ پھر یہی رسولِ ہاشمیؐ ہی ہوں گے۔ جن کو مقامِ محمود کی جلوہ گری اور حوضِ کوثر کی ساقی گری کا عزو شرف کا موقعہ حاصل ہو گا۔

آپؐ وجہِ تخلیقِ عالم ہیں
علامہ اقبال علیہ الرحمہ کی زبان سے سُنیئے

ہو نہ یہ پھول، تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسّم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو، تو پھر مے بھی نہ ہو، خُم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے
دشت میں، دامنِ کہسار میں میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراقش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ دیکھے

بقیہ : خطبہ جمعہ

تبدیلی کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ اور یہ طے شدہ امر ہے کہ حضرت حمزہؓ کے علاوہ کسی اور شہید کو سید الشہداء کہنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

سیّدنا حمزہؓ کی مظلومیّت

محترم حضرات! جنگ اُحد سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ واپس تشریف لائے تو مدینہ میں صف ماتم بچھ چکی تھی کہ ستر گھر اس سے متاثر ہوئے تھے۔ ہر طرف سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہر شہید پر کوئی نہ کوئی رونے والا موجود تھا لیکن حمزہؓ کا نوحہ خواں کوئی نہ تھا۔ رقّت کے جوش میں آپؐ کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ "اَمّا حَمْزَۃُ فَلَا بَوَاکِیَ لَہٗ" لیکن حمزہؓ پر آنسو بہانے والا کوئی نہیں۔

فرمودات ربّانی

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (الفجر ۱۴)
بلاشبہ تیرا پروردگار تو تجھے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (الانعام ۱۰۳)
اگرچہ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا مگر وہ سب کو دیکھتا ہے۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق ۱۶)
ہم تو تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہیں۔

وَلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا (یونس ۶۱)
تم جو کوئی کام بھی کر رہے (ہوتے) ہو ہم تمہارے پاس موجود ہوتے ہیں۔

زندگی ایک دن ہو یا سو سال گذر جاتی ہے
کمبلی ہو کاندھے پہ یا شال گذر جاتی ہے
امیروں کی اگر باقبال گذر جاتی ہے
غریبوں کی بھی بہرحال گذر جاتی ہے

علوم کی ترویج میں مساجد کا کردار

خالد شیخ

تمام الہامی مذاہب نے اپنے ماننے والوں کو حصولِ علم کی تلقین کی ہے کیونکہ علم ہی وہ جوہر ہے جس کی بناء پہ انسان دیگر حیوانات اور مخلوقات سے افضل قرار پایا۔ چنانچہ حضرت آدمؑ کو ملائکہ پر جو برتری اور فضیلت حاصل ہوئی وہ بھی علم ہی کا نتیجہ تھی۔ اس کے علاوہ انسان نے جو ارتقائی منزلیں طے کیں یا تہذیب و معاشرت، تمدن و ثقافت اور ایجادات و اختراعات کو فروغ دیا۔ یہ سب کچھ علم ہی کا مرہونِ منت ہے۔

اسلام چونکہ دینِ کامل ہے اس لئے اس میں پہلی وحی کا آغاز ہی اقراء (پڑھ) سے ہوا۔ اس کے علاوہ سورۂ رحمان اور دیگر کئی سورتوں میں خدا نے علم کی اہمیت و فضیلت وضاحت سے بیان کی ہے اور مسلمانوں کو ہر قسم کے علوم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے۔ خصوصاً سائنسی علوم کے متعلق بار بار تاکید کی ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت مکہ جیسے مرکزی شہر میں صرف تیرہ آدمی تعلیم یافتہ تھے۔ لیکن حضورؐ نے دعوتِ اسلام کے آغاز کے ساتھ ہی اپنے صحابہ کو لکھنے پڑھنے کی تلقین کی چنانچہ مکی زندگی کے ابتلاء و آزمائش کے دور میں ہی صحابہ کرامؓ نے علم حاصل کرنے پہ بھرپور توجہ دی بعض نے کتابت وحی کی سعادت حاصل کرنے، بعض نے ارشاداتِ نبویؐ کو محفوظ کرنے اور بعض نے یہود و نصاریٰ کے دینی معتقدات سے واقفیت ہونے کے لیے علم حاصل کیا۔

مسلمانوں کے دورِ عروج میں دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی ایک مسجد سے ملحق تھی،

ہجرت کے بعد مدینہ اسلام کا مرکز بنا۔ جہاں مسلمانوں کو مکہ کی نسبت بہت زیادہ آزادی اور خود مختاری حاصل تھی اور جہاں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ اب مسلمان ایک مذہبی جماعت ہی نہ تھے بلکہ انہیں سیاسی استقامت بھی حاصل ہو چکی تھی۔ اس لیے حضورؐ نے علوم کی ترویج کے لیے عملی کوششیں شروع کیں اور اس سلسلے میں مسجد نبویؐ کو مکتب اور مدرسے کی حیثیت عطا کی، اور پہلی درس گاہ اسی مسجد مبارکہ میں قائم ہوئی۔ حضورؐ نے مسجد میں چبوترہ بنایا جس پہ کھجور کے پتوں کی چھت (صفہ) ڈالی گئی تھی۔ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت اسی چبوترے پر بیٹھ کر تحصیل علم کا اہم فریضہ انجام دیتی۔ حضورؐ اس درسگاہ کے معلم اعظم تھے۔ آپؐ کی تعلیم و تربیت سے علم کی پیاسی یہ جماعت علم کا عملی مظہر بن گئی — ان حضرات میں سے اکثر آگے چل کر بڑے بڑے مفسر، فقیہہ، محدث اور معلم بنے۔ پھر جیسے جیسے اسلام کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ویسے ویسے علوم و فنون بھی پھیلتے چلے گئے۔ جہاں کوئی مسجد تعمیر ہوتی وہیں مدرسہ بھی قائم ہو جاتا۔ ہر مسجد جہاں عبادت و ریاضت اور مسلمانوں کے اجتماعی کردار کی مظہر ہوتی وہاں ہر قسم کے علوم و فنون کا مرکز بھی بن جاتی۔

خلافتِ راشدہ کے دور

میں اسلام کو بڑی وسعت نصیب ہوئی۔ عہدِ فاروقی میں شام، مصر، ایران، عراق، یمن وغیرہ ممالک اسلامی اقتدار کے زیرِ نگیں آئے۔ اور ان ملکوں کی بیشتر آبادی اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئی۔ شہر شہر اور قریہ قریہ میں مسجدیں تعمیر ہونے لگیں۔ اس کے ساتھ اسلام اور اس کی تعلیمات سے روشناس ہونے کی خواہش نومسلموں میں بھی پیدا ہوئی۔ اس وقت مساجد کو مکتبوں کے طور پر استعمال کیا گیا اور اس طرح مفتوحہ ممالک میں ہر مسجد مکتب بن گئی۔ جن میں بچوں کو تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ تعلیم بالغان کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اس طرح ہزاروں جاہل لوگ علم کی دولت سے مالا مال ہو گئے اور جہالت کے اندھیروں سے باہر آ گئے۔ یہ سب اس لیے کیا گیا کہ اسلام نے ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا فرض قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کے لوگ جو ظہورِ اسلام سے قبل بالکل اَن پڑھ اور جاہل تھے، جن کے پاس نہ تو کوئی تہذیبی ورثہ تھا اور نہ ہی کوئی علمی سرمایہ۔ دیکھتے ہی دیکھتے مروجہ علوم و فنون کے ماہر اور معلم بن گئے۔ انھوں نے سب سے پہلے اسلامی علوم کی ترویج پر توجہ دی۔ چنانچہ علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ، علم لغات اور علم صرف و نحو وغیرہ خلافت راشدہ کے دور ہی میں وجود میں آ گئے۔ عربی رسم الخط جو بالکل ابتدائی حالت میں تھا اس کو حضرت علیؓ اور ان کے شاگردوں نے مربوط و منظم کیا۔ صرف و نحو کا علم بھی حضرت علیؓ کی بدولت وجود میں آیا۔

اُموی دور میں اسلامی علوم نے مزید ارتقائی منزلیں طے کیں اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر علوم پر بھی مسلمانوں نے توجہ دی۔ امیر معاویہؓ نے تاریخ کی پہلی کتاب اپنے دورِ حکومت میں مرتب کروائی۔ خلیفہ عبدالملک نے جو خود ایک عالم فاضل شخص تھا ترویج علوم پر خصوصی توجہ دی۔ اساتذہ کی تنخواہیں اور طلبہ کے وظائف سرکاری طور پر مقرر کیے حدیثؐ کی کتابیں تحریر کروائیں، فقہ کی حوصلہ افزائی کی۔ امام مالکؒ نے اسی دور میں اسلامی فقہ کی پہلی کتاب "الموطا" کے نام سے ترتیب دی۔ اس زمانے میں سیرت کا فن وجود میں آیا اور حضورؐ کی سیرت پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ذاتی طور پر اہم کردار ادا کیا۔ اسی دور میں طب، جغرافیہ، نجوم، ریاضی، وغیرہ پر کتابیں لکھی گئیں۔

دور اسلامی تہذیب و ثقافت اور علوم و فنون کا دورِ عروج ہے۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے مسلمان ذہنی اور فکری اعتبار سے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے۔ عباسی خلفاء نے کشور کشائی اور فتوحات پر توجہ دینے کی بجائے عالم اسلام کی داخلی استقامت اور عوام کی خوشحالی اور فارغ البالی کو اپنا نصب العین بنایا۔ جس کے نتیجے میں علوم و فنون کو درجہ کمال تک پہنچنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں فنِ کتابت، عربی رسم الخط، صرف و نحو علم لغت وغیرہ درجہ کمال تک پہنچ چکے تھے۔ کاغذ کی بھی فراوانی تھی ان اسباب کے تحت عباسی عہد کے مسلمانوں کو موقع ملا کہ وہ ایک طرف تو خالص اسلامی علوم کو نقطۂ عروج تک پہنچائیں اور دوسری جانب دوسرے علوم میں غیر معمولی مہارت حاصل کریں۔ چنانچہ اس دور میں یونانی، ایرانی، ہندوستانی اور دیگر اقوام اور ممالک کی علمی ترقیوں سے پورا پورا استفادہ کیا گیا اور ان میں حیرت انگیز اضافے کئے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کا کوئی بھی علم ایسا نہ رہا جس پر مسلمانوں کو دسترس حاصل نہ ہوئی ہو۔ انھوں نے اپنی اجتہادی صلاحیتوں سے کام لیا۔ مختلف علوم کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ بغداد شہر جو کہ اس وقت کی تہذیب و تمدن کا

(باقی ۲۳ پر)

مولانا آزاد کی خدمت قرآن

ایک صاحب کی لاعلمی پر ان کی خدمت میں تصویر کا صحیح رُخ

مکرمی سلام مسنون!

آپ نے مئی ۱۹۸۰ء کے "میثاق" میں دعوتِ قرآنی کی تائید میں مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے نقل کی ہے اور تعارفی سطروں میں لکھا ہے:

"جو اس دور میں ظاہر ہوئی جب وہ جمیع اسلامیانِ ہند کی آنکھ کا تارا تھے اور انہوں نے ابھی انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی۔"

آپ کے سنجیدہ قلم سے یہ خلافِ واقعہ اور تاریخ وہ سطریں دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔ میرا خیال تھا کہ آپ وقت کے مباحث سے دامن بچا کر مقاصد کی راہ میں آگے بڑھتے رہنے والے شخص ہیں۔ لیکن آپ کے ان جملوں سے اندازہ ہوا کہ آپ کا نکتہ چیں ذہن ٹھیک ٹھاک جماعتِ اسلامی کا تربیت یافتہ ہے اور آپ بہت محدود دائرے میں اور صرف اپنی شخصیت کے چراغ کی روشنی میں دیکھنے کے عادی ہیں۔

کیا آپ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ کانگریس میں شرکت کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے دعوتِ قرآنی کی اس راہ کو ترک کر دیا تھا؟ بالفرض اگر آپ کے خیال میں ایسا ہی تھا تب بھی آپ کی دعوت کو ان جملوں سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ ایک شخص اپنے نصف صدی کے عمل سے اپنے قول و فکر کو جھٹلا رہا ہے اور آپ اسے اپنی دعوت کی تائید میں پیش کر رہے ہیں، اور اگر آپ کو اس قول سے فائدہ اٹھانا ہی تھا تو آپ کو چاہیے تھا کہ قول پیش کر دیں اور ان کی زندگی و فکر کے انقلاب کے فیصلے کو ان کے خدا کے حوالے کر دیں کہ عقیدہ و عمل کا وہی سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔

لیکن اگر آپ نے ایسا سوچ لیا تھا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ بات حقیقت کے خلاف ہے اور اس میں ذرہ برابر سچائی موجود نہیں ہے۔

آپ نے مولاناؒ کی جس تحریر کا حوالہ دیا ہے وہ نومبر ۱۹۱۵ء کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے خیال میں اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد "ملت کے عظیم فرزند" اور "جمیع اسلامیانِ ہند کی آنکھوں کا تارا" تھے اور بعد میں جب انہوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی تو وہ ان خصائص سے محروم ہو گئے۔

اچھا ہوتا کہ آپ اس انقلاب حالات یا حادثہ شمولیت کانگریس کی تاریخ بھی بیان کر دیتے۔ اس لیے کہ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ کانگریسی تو ۱۹۱۵ء سے پہلے بھی تھے۔ اس لیے اگر کوئی انقلاب آیا بھی تھا تو اس کی وجہ کانگریس میں شمولیت تو نہیں ہو سکتی! اور جس زمانے کی یہ تحریر آپ نے پیش کی ہے اور جس زمانے میں وہ "ملت کا عظیم فرزند" اور "جمیع اسلامیانِ ہند کی آنکھ کا تارا" تھے۔ سیاسی اصطلاح میں ان کی زندگی کا وہ دور بھی کانگریسیت کا دور تھا۔

آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ مولانا آزادؒ نے ۱۹۰۵ء میں اپنے سیاسی نصب العین کے بارے میں ایک فیصلہ کیا تھا۔ اس فیصلے کے مطابق وہ سب سے پہلے بنگال کے انقلاب پسندوں سے متعارف ہوئے اور بڑی مشکل سے انہوں نے ان کا اعتماد حاصل کیا تھا۔ ۱۹۲۰ء تک وہ اسی مسلک پر قائم اور اسی کے لیے کوشاں رہے۔ شاید آپ کو یہ بات بھی معلوم نہ ہو کہ دسمبر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جس اجلاس میں مسلم لیگ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا اس میں مولانا آزاد شریک تھے اور سب سے پہلے جن لوگوں کو مسلم لیگ میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی ان میں مولانا آزادؒ بھی تھے۔ لیکن مولاناؒ چونکہ اس فیصلے کے پس منظر سے واقف تھے اس لیے مسلم لیگ کی دلربائیاں ان کے لیے وجہ کشش نہ بن سکیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی

تب بھی چونکہ وہ ایک سیاسی فکر اور مسلک رکھتے ہیں اس لیے مسلم لیگ میں ان کی شمولیت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۰۸ء میں خواجہ حسن نظامی کے ایک پرچہ پر لکھ دیا تھا "سب باتیں منظور باستثنائے شرکتِ مسلم لیگ"۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجیے کہ آپ مولانا آزادؒ کو ان کی زندگی کے ایک دور کے استثنا کا جو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں، وہ تو نہ پہنچا! مولاناؒ نے ۱۹۱۲ء میں جب الہلال جاری کیا تھا اور شاید یہی وقت تھا جب وہ بقول آپ کے "ملت کے عظیم فرزند" اور "جمیع اسلامیانِ ہند کی آنکھ کا تارا" تھے تب تو وہ نہ صرف کانگریسی تھے بلکہ انقلاب پسند اور دہشت گرد تھے اور تین سال کے کامل صحافتی و سیاسی کے بعد اسی جرم کی پاداش میں الہلال بند ہوا تب بھی وہ اپنے سیاسی فکر و مسلک کے اسی مقام پر تھے اور پھر ایک سال کے وقفہ کے بعد ۱۹۱۵ء کے اواخر میں جب انھوں نے البلاغ جاری کیا جب بھی وہ اسی سیاسی فکر کے حامل تھے پھر جب ۱۹۱۶ء تا ۱۹۲۰ء رانچی کی نظر بندی، جنوری ۱۹۲۰ء میں آزادی، پھر تحریکِ خلافت اور تحریک ترکِ موالات کے ہنگامے، اور پھر دسمبر ۱۹۲۱ء میں جب ان کی گرفتاری عمل میں آئی تھی اس وقت بھی وہ اسی سیاسی فکر پر یقین رکھتے تھے۔ اسی دوران میں انھوں نے جامع الشواہد کے نام سے غیر مسلموں کے مسجد میں داخلے کے موضوع پر ایک عجیب و غریب رسالہ لکھا جو تحقیق کا شاہکار ہے اسی دوران میں انھوں نے "تذکرہ" کے نام سے دعوت و عزیمت کی ایک دلفریب تاریخ لکھی اور "مسئلۂ خلافت و جزیرۂ عرب" کے عنوان سے ایک بے مثال خطبہ دیا جو بعد میں صحبت سے اضافوں کے ساتھ کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی۔ یہی زمانہ تھا جب مولاناؒ نے علی پور (کلکتہ) جیل میں اپنا مشہور عدالتی بیان پیش کیا جو قولِ فیصل کے نام سے بار بار چھپتا رہا ہے۔ اس باب میں دو رائے نہیں کہ اردو کے دینی، تاریخی اور سیاسی لٹریچر میں کیا بلحاظِ مطالبہ اور کیا بلحاظِ زبان ان کتابوں کی نظیر موجود نہیں ہے لیکن اگر مولاناؒ کا کانگریسی ہونا کوئی جرم تھا تو کانگریسی تو وہ اس وقت بھی تھے۔ پھر آپ سوچیے یہ کیسا کانگریسی ہے جو مسلمانوں کی تمام تباہ حالیوں اور بدبختیوں کا علاج صرف قرآنِ حکیم کی تعلیم و اشاعت اور تزکیہ و تربیت الٰہی، اسلام کے جماعتی نظام، شریعت کی پابندی، اسوہ نبوی کے کامل اتباع اور اتحادِ عالمِ اسلامی کو قرار دیتا ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں یہ بات ہو کہ یہ دوران کی کانگریسیت کا دور نہیں تھا اگرچہ یہ بات بھی تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ الہلال کی دعوتِ سیاسی کا سب سے پہلا اصول ہی ہندو مسلم اتحاد، سیاسی مقاصد کے لیے مشترکہ و متحدہ جدوجہد اور اپنی کسی بات سے بھی تعبیری قوت کو فائدہ نہ پہنچنے دینے کا عزم تھا۔ اور یہی اس کا وہ جرم تھا جس کی پاداش میں وہ بند کیا گیا تھا۔ بالفرض اگر آپ کا یہ گمان درست ہے کہ ان کا پہلا دور اسلامی دعوت کا دور ہے اور یہی وہ دور ہے جب وہ ملت کے عظیم فرزند کے منصب پر فائز تھے اور جمیع مسلمانوں کی آنکھوں کا تارا بنے ہوئے تھے اور اس وقت تک وہ کانگریس میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اور اگر آپ کے خیال کے مطابق کانگریس میں مولانا آزادؒ کے داخلے کی تاریخ ۱۹۲۳ء کا وہ واقعہ ہے جب انہیں کانگریس کے خاص اجلاس منعقدہ دہلی کا صدر چنا گیا تھا۔ تو پھر آپ کے خیال کے مطابق لازم ٹھہرے گا کہ ۱۹۲۳ء کے بعد انھوں نے قرآن کی تعلیم و اشاعت کی کوئی دعوت نہ دی ہو گی جو الہلال کی اشاعت کا اہم مقصد اور اس کی دعوت کا مرکزی نقطہ تھا۔

لیکن معترضین کی بدقسمتی کہ واقعات اس کے خلاف ہیں۔ وہ اپنے دعوے کو تاریخ سے ثابت کرنے سے قاصر رہیں گے ایک سرسری نظر ان واقعات پر بھی ڈال لینی چاہیے۔

۱۹۲۷ء میں مولانا آزادؒ نے الہلال کو دوبارہ جاری کیا۔ الہلال کی یہ نشاۃ ثانیہ اس کے دورِ اول کی دعوت و تعلیم کے احیاء کے لیے، قیامِ ملت کے مقاصدِ عظیمہ کے لیے مسلمانوں کی مذہبی اصلاح کے لیے، ان میں دینی شعور اور قرآنِ حکیم کا ذوق پیدا کرنے کے لیے، سیرت

اسلامی کی تعلیم و تربیت کے لیے، مسلمانوں
میں جماعتی زندگی کا احساس پیدا کرنے
کے لیے اور مسلمانوں کو انتشار و تشتت
کی غیر اسلامی و جاہلی زندگی کی معصیت
سے نکالنے کے لیے تھی۔ لیکن دورِ ثانی
میں جس طرح اوّلین مقاصد اجرائے
الہلال پیشِ نظر تھے دوسرے اور
سیاسی مقاصد بھی اسی طرح مطلوب
تھے۔ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں
دیگر برادرانِ وطن کے شانہ بشانہ حصہ
لینا اور اس خالص نیشنل اور پولیٹیکل
تحریک کا یہ اسلامی اور مذہبی پہلو بھی
تھا کہ بے شمار مسلمان ممالک کی آزادی
اور برٹش استعمار سے نجات کا راستہ
آزاد ہندوستان سے ہو کر گزرتا تھا
ممکن ہے اس وقت اس حقیقت کے
اعتراف میں کسی کو پس و پیش ہو لیکن
اب تو یہ توقعات تاریخ کے واقعات
بن چکے ہیں اور ہندوستان کی آزادی
کے نتیجے میں بیسیوں مسلمان ممالک برٹش
استعمار کے شکنجے سے آزاد ہو چکے ہیں۔
۱۹۲۸ء کے آغاز میں جب سائمن
کمیشن کے خلاف تحریک کے سلسلے
میں حضرت مولاناؒ لاہور تشریف لائے
تو اسلامیہ کالج کے طلبہ کو انہوں نے
اپنے مقاصد سیاسی کے ساتھ جس
دعوت دینی کی طرف توجہ دلائی اور
انہیں جس راہ اعتدال پر چلنے اور وسیلہ
فلاح و سعادت کو اختیار کرنے کی
تلقین فرمائی وہ ان کے اپنے الفاظ
میں یہ ہے:

"مسلمانوں کے لیے راہِ اعتدال ایک ہی
ہے۔ اور وہ ہے خدا کے کلام اور رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی
پیروی اور پابندی۔ مسلمانوں کو قرآن
مجید کے مطالعہ پر زیادہ توجہ کرنی
چاہیے جو ہر حال اور ہر زمانے میں
ان کا رہنما ہے۔ یہی ان کے لیے فلاح
و کامیابی کا وسیلہ ہے۔"

مولانا آزادؒ کے ان افکار میں ان کے
ترجمان القرآن کے مقاصدِ اشاعت تلاش
کیے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ اس کی تاریخ
الہلال دورِ اول کے اجرا سے شروع
ہوتی ہے لیکن پیشِ نظر مقاصد کے فہم و
بصیرت کے لیے صرف اس کے بعد
کی تاریخ پر نظر ڈال لیجیے۔ ۱۹۳۱ء
میں ترجمان القرآن جلد اول کی اشاعت
۱۹۳۶ء میں جلد دوم کی اشاعت۔
اس کے بعد اس کی دوسری اشاعتوں
کے لیے پیش رفت، اور سرو سامان
کی فراہمی کے لیے کوششیں ۱۹۴۲ء
میں گرفتاری اور قلعہ احمد نگر میں قید و
بند کی خلوتوں میں قرآن حکیم کا مطالعہ
اور ترجمان القرآن پر نظرِ ثانی کی توفیق رہی
ان کے دینی ذوق اور قرآن حکیم کی تعلیم
و اشاعت کے فروغ کے لیے ان کے
جذباتِ صادقہ کے واضح ثبوت ہیں
لیکن ٹھیک اسی دور میں جب مولاناؒ
ترجمہ و تفسیر کے کاموں میں مصروف تھے
مسلمانوں کو قرآن مجید کے مطالعہ پر
توجہ دلا رہے تھے، قرآن حکیم کی رہنمائی
قبول کرنے اور اسی وسیلہ فلاح کو مضبوطی
کے ساتھ پکڑ لینے کی دعوت دے رہے
تھے۔ وہ سیاسی اصطلاح میں پکے اور
کٹر کانگریسی بھی تھے۔ ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے
کہ مولاناؒ نے کلکتہ کی جامع مسجد میں خطباتِ
جمعہ کا سلسلہ شروع کیا۔ سیف بنارسی
نے "خطباتِ جمعات و عیدین" کے نام
سے یہ خطبات چھاپ دیئے ہیں۔ ان میں
آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مولاناؒ نے ان میں
مسلمانوں کی دینی و جماعتی زندگی کا پورا
نظام پیش کر دیا ہے۔ یہ خدمت بھی
ایک کانگریسی مسلمان اور عالمِ دین کی تھی۔
اگر آپ کی عدم استعداد یا پست ہمتی
نے آپ کو ایک اسلامی مملکت میں وقت
کے جبر کے خلاف جہاد اور اقدام و سعی
کی توفیق سے محروم کر دیا ہے اور اپنی
اس محرومی اور بزدلانہ خلوت گزینی پر
شرم نہیں آتی تو کم از کم اس صاحبِ عزیمت
دین و سیاست کے مرج البحرین،
جامِ شریعت اور سندانِ عشقِ حریت
کے جامع اور اس شخص کو تو برا نہ کہیے
جو زندگی بھر سیاہ کو سفید کہنے سے انکار
کرتا رہا تھا۔

اب اگرچہ ہم سلسلہ بحث میں ۱۹۴۶ء
تک پہنچ چکے ہیں لیکن قرآن حکیم کی تعلیم
و اشاعت کے لیے مولانا آزادؒ کے ایک
اہم منصوبے پر روشنی ڈالنی چاہتے ہیں
اس کے لیے ہمیں ان کے افکارِ دینی و
قرآنی کے سلسلہ ارتقاء پر نظر ڈالنی
ہو گی اور ۱۹۲۳ء تک لوٹنا پڑے گا۔
۱۹۲۳ء کے بعد مولانا آزادؒ کے غور

ذ ماں نے ایک مستقل نظامِ فکر کی شکل اختیار کر لی تھی اور قرآن حکیم کی تعلیم و اشاعت کے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کر لیا تھا۔ اگر ۱۹۱۴ء میں انھوں نے کلکتہ میں دارالرشاد کے زیرِ اہتمام قرآن حکیم کے درس و تعلیم کا انتظام کیا تھا تو ۱۹۳۱ء میں قرآنِ حکیم کی تعلیم و اشاعت کے لیے ایک علمی و اشاعتی ادارے کے قیام کی ضرورت کا اعلان کر دیا تھا۔ جہاں تک اس ادارے کے مقاصد اور لائحہ عمل کا تعلق ہے اس کے خصائص و تفصیلات آپ ترجمان القرآن جلد اول کے پہلے ایڈیشن میں یا آخری ساہتیہ اکیڈمی ایڈیشن میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس میں مولانا نے مسلمانوں کی مذہبی اصلاح کے لیے سب سے پہلی چیز وقت کی ضروریات کے مطابق قرآن کی تعلیم و اشاعت کے سروسامان کی فراہمی کو قرار دیا ہے، پھر انھوں نے قرآن کی تعلیم و اشاعت کے لیے امور چہارگانہ کی ضرورت واضح کی ہے۔ پھر الہلال کی دعوت قرآن اور اس کے نتائج نیز مذہبی اصلاح و تجدید کے عام احساس کے ذکر کے بعد "تکمیل کار اور مطلوبہ سروسامان" کے عنوان سے ان امور پنجگانہ پر روشنی ڈالی ہے جن کے بغیر "قرآن کی تعلیم و اشاعت کا مقصد عظیم پورا نہیں ہو سکتا"۔ مولانا آزادؒ کے ذہن میں تکمیل کار کا جو نقشہ اور کام کے جو مختلف میدان اور ان کا جو معیار تھا وہ نصف صدی مزید گزرنے کے بعد بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ حالانکہ قرآنِ حکیم کی دعوت و تعلیم کا نہ صرف احساس پایا جاتا ہے بلکہ ہندوستان اور پاکستان میں مستقل تحریکیں اور تنظیمیں موجود ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی مذہبی اصلاح و تجدید اور عالمی سطح پر قرآن کی تعلیم و اشاعت کی مختلف صورتوں اور ان کی اہمیت کا اندازہ شناس بھی کوئی موجود نہیں۔ سروسامان اور ایسے اداروں کی تلاش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مسلمانوں کی مذہبی اصلاح کے لیے قرآن حکیم کی تعلیم و اشاعت کی مولانا آزادؒ نے جو دعوت دی تھی وہ بے اثر نہیں رہی حیدرآباد کے مولانا ابو محمد مصلح کی تحریک قرآن مولانا آزادؒ کی دعوتِ قرآنی کی صدائے بازگشت تھی۔ مولانا مصلح نے انھی مقاصد عظیمہ جلیلہ کے لیے اپنا ادارہ قائم کیا تھا جن کی طرف مولانا آزادؒ نے ترجمان القرآن جلد اول میں توجہ دلائی تھی۔ مولانا مصلح نے اپنی تحریک کے ترجمان کا نام بھی مولانا آزادؒ سے عقیدت کی بنا پر ان کے "ترجمان القرآن" کے نام پر رکھا تھا جس کا وجود آج بھی مولانا آزادؒ کی دعوتِ قرآنی کی یاد دلاتا ہے۔ یہ بات بھی کوئی راز نہیں کہ خواجہ عبدالحئی فاروقی، مولانا محی الدین قصوری، مولانا محمد علی قصوری، مستری محمد صدیق وغیرہم کا ذوقِ قرآن فہمی حضرت مولانا آزادؒ کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ اور صحبت کا فیضان تھا۔ جماعتِ اسلامی کی دعوت میں قرآن حکیم کے درس و مطالعہ پر زیادہ زور مولانا آزادؒ کی دعوتِ قرآنی سے اثر پذیری ہی کا نتیجہ ہے۔ حتیٰ کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تفہیم القرآن میں تفسیری ترجمہ کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ مولانا آزادؒ کے ترجمان القرآن سے مستفاد ہے۔

ترجمان القرآن جلد اول کی جس تحریر کا اوپر ذکر آیا ہے، وہ ۱۹۳۱ء کے آخر کی ہے۔ اگر اس دور کے بارے میں بھی آپ کا یہ اعتقاد ہو کہ شاید ابھی ان پر کانگریس کا پورا رنگ نہ چڑھا تھا۔ اور ۱۹۴۰ء میں جب وہ کانگریس کے دوبارہ صدر بنائے گئے تھے تو شاید ان کے خیالات میں کوئی تبدیلی آئی ہو گی۔ تو آئیے اس واقعہ پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے حضرت مولانا آزادؒ نے کانگریس کے خالص سیاسی افکار و مسائل سے بھرپور خطبہ صدارت میں بھی اپنے جس دینی اعتقاد کا ببانگِ دہل اظہار و اعلان کیا۔ اس کے مطالعے سے یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے کہ کانگریس میں شریک ہونے کے بعد ان کے مذہبی افکار اور دینی معتقدات میں کسی قسم کی تبدیلی آ گئی تھی۔ مولاناؒ رام گڑھ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں فرماتے ہیں:

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کے تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں ہوں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں،

بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی بلکہ وہ اس راہ میں میری راہ نمائی کرتی ہے میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے، میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل فیکٹر (FACTOR) ہوں، میں اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہم اپنے ساتھ کچھ ذخیرے لائے تھے اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیئے ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گذر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے، اور ہندو مذہب کا پیرو ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔"

کیا اس کے بعد بھی مولانا آزادؒ کے طرزِ فکر یا مذہبی معتقدات کے بارے میں کوئی شک و شبہ رہ جاتا ہے؟ اور یہ کہنے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ کانگرس میں شمولیت کے بعد ان کے مذہبی افکار اور دینی معتقدات میں کوئی تبدیلی آگئی تھی یا احیائے ملت اور مذہبی اصلاح و تجدید کی ضرورت کا احساس ان کے قلب سے مٹ گیا تھا؟

دراصل ساری خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ مولانا آزادؒ کے تقسیم کار کے اصول اور طریقۂ کار سے واقفیت نہیں ہے۔ مختصراً عرض کر دوں کہ وہ دور جہاں سے انہوں نے عملاً سیاسی زندگی کو اختیار کیا اور جس کا طعنہ آپ نے بھی دیا ٹھیک اسی دور میں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت ملت کی اصلاح و تجدید، مسلمانوں کی تعلیمی سماجی اور اجتماعی زندگی کے خاص مقاصد اور ضروریات کی تکمیل اور اس کے دعوت و تحریک اور ہر قسم کی جدوجہد کے لیے مولانا آزادؒ نے جمعیۃ علمائے ہند کا پلیٹ فارم اختیار کر لیا تھا۔ مولانا جمعیۃ کے تاسیسی اجلاس میں تو شریک نہیں تھے لیکن وہ اس کی پہلی مجلسِ عاملہ میں شریک تھے اور اپنی وفات تک وہ ہمیشہ اس کے فیصلوں میں شریک رہے اور اپنے علم و بصیرت کے مطابق اس کی رہنمائی کرتے رہے۔ ایک مصنف کے بقول جمعیۃ علمائے ہند مولانا آزادؒ کے ملی اور دینی افکار کی تصویر ہے۔ اس کے علاوہ بھی مسلمانوں کی تعلیم و اصلاح کی متعدد تحریکات اور خدمت گذارانِ ملت موجود تھے جنہیں مولانا کی حمایت اور رہنمائی حاصل تھی۔ البتہ ملک کی آزادی اور سیاسی جدوجہد کے لیے انہوں نے ۱۹۰۶ء میں یا اس سے بھی پہلے جو فیصلہ کیا تھا اسی پر عمل پیرا رہے فرق اگر کبھی پڑا تو رسمی تعلق میں۔ ۱۹۲۳ء سے قبل وہ شاید کانگرس کے دو آنے کے ممبر بھی نہ ہوں۔ ۱۹۲۳ء کے بعد وہ اس کے عام ممبر ہی نہیں اس کی ہر ورکنگ کمیٹی کے ممبر منتخب ہوتے رہے۔ لیکن اس بحث سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

اب اگر آپ تھوڑا اور آگے بڑھ جائیں تو پھر منزل ۱۹۴۷ء کی سامنے آجاتی ہے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد دہلی کی مولانا آزادؒ کی ایک یادگار تقریر ہے۔ اس میں انہوں نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ میں تمہارے لیے کوئی نیا نسخہ لے کر نہیں آیا۔ میرے پاس وہی پیغام الٰہی ہے جو آج سے چودہ سو برس پہلے مسلمانوں کو ایک ایسے ہی نازک دور میں دیا گیا تھا۔ جب انہوں نے اپنی توقع کے خلاف شکست کا ایک سخت زخم کھایا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر تم مسلمان ہو تو پھر تمہارے دل میں نہ تو خوف کا کوئی

خوف ہونا چاہیے نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ اور خطرہ۔ ولا تہنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔

جس بزرگ ہستی نے تاریخ کے ایک نازک موقع پر، جب کہ وقت نے اس کے لیے طعن وتشنیع کے تیر برسانے کا جواز بھی مہیا کر دیا تھا، مسلمانوں کو ان کا چودہ سو برس کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا تھا، آپ اسی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "یہ رائے ان کی اس وقت کی ہے جب انہوں نے کانگرس میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی"

آپ اس بات کو فراموش مت کیجیے کہ برصغیر میں جب "تاریخ دعوتِ قرآن" لکھی جائے گی تو اس کا آغاز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تعلیم وترجمہ قرآن کی کوششوں سے ہوگا۔ اس کے بعد ان کے فرزندانِ رشید میں شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر پھر بعض دیگر حضرات کے بعد مولانا عبیداللہ سندھی کے مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ (دہلی) اور ان کے استاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال کی دعوتِ قرآنی مدرسہ دارالرشاد (کلکتہ) کے قیام و مقاصد، ترجمان القرآن کی اشاعت اور قرآن کی تعلیم واشاعت کے ایک ادارے کی ضرورت، مولانا ابو محمد مصلح کی دعوت قرآنی، مولانا حمیدالدین فراہی، مولانا عبیداللہ سندھی کے بعض تلامذہ اور بیت الحکمت لاہور کے زیر اہتمام مولانا سندھی کے تفسیری افادات کی ترتیب واشاعت، مولانا غلام اللہ خان، مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہم کی خدماتِ قرآن کے تذکار واعترافات کے جلی ابواب و عنوانات کے بعد ....

اور آپ کی تحریک خدام القرآن کا ذکر بھی آئے گا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمتِ قرآن تو اس تاریخ کا ایک مستقل، طویل اور روشن باب ہوگا۔ ہمیں کسی وجہ سے "تاریخ دعوتِ قرآن" کے ان جلی عنوانات کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے۔ لیکن آپ کو بھی محض اپنا چراغ روشن ثابت کرنے کے لیے تاریخ کو مسخ کرنے کی سعی نامسعود ہرگز نہ کرنی چاہیے۔

میرا خیال ہے کہ کانگرس اور مسلم لیگ سے وابستگی یا عدم وابستگی ایسے مسائل نہیں ہیں جن کی بنا پر ایک مسلمان کے ایمان وکفر کا فیصلہ کر دیا جائے اور آپ ایک عالمِ دین کے بارے میں ایسے نازیبا الفاظ استعمال کریں۔ ہندوستان میں کانگرس ایک قومی جماعت تھی اس میں ہندوستان میں بسنے والی تمام قوموں کے لوگ شامل تھے۔ چونکہ اس ملک میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اس لیے کانگرس میں بھی وہی اکثریت میں تھے۔ ٹھیک اسی طرح دوسری قومی جماعت "مسلم لیگ" تھی۔ اگرچہ اس کے نام میں مسلم کا لفظ شامل تھا لیکن لیگ قریب قریب نظریات، رکھنے والے مسلمان اور غیر مسلمان سبھی شامل تھے۔ قادیانیوں کے بارے میں تو اب حکومت نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ وہ غیر مسلم ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی غیر مسلم قومیں مسلم لیگ کے قیام سے آج تک اس کی ہیئت ترکیبی اور نظام میں شامل ہیں۔ آپ اگر اس حقیقت سے انکار فرمادیں تو بعض عناصر کا نام لے کر آپ سے دریافت کرلوں کہ امتِ مسلمہ کا اجتماعی فتویٰ ان کے بارے میں کیا ہے اور آپ اس سے متفق ہیں یا نہیں؟

آپ اگر ماضی میں کسی قومی، سیاسی جماعت کے ساتھ نہیں رہے اور آج بھی نہیں ہیں اور آپ کی پست ہمتی نے آپ کو وقت کے جبر کے خلاف آواز اٹھانے کی توفیق سے محروم کر دیا ہے تو اب کون سی ضرورت آپڑی ہے کہ اپنے دامن اور چہرے کو سیاست کے گرد وغبار سے آلودہ کریں اور دوسروں پر کیچڑ اچھالیں۔ وما علینا الا البلاغ

آپ کا مخلص

ابو سلمان شاہ جہان پوری

وقف قرآنی

شیخ القرا حضرت مولانا قاری اظہار احمد صاحب تھانوی مدظلہٗ

استفتاء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم،
اَحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم،

کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ میں کہ قرآن مجید میں تلاوت کرنے والوں کے لیے صحیح اور مناسب موقع محل پر ٹھہرنے اور سانس لینے کی غرض سے علماء اوقاف نے وقف کی جو قسمیں کی ہیں مثلاً تام مختار، کافی جائز، حسن مفہوم، قبیح متروک وغیرہ وغیرہ۔ اور علامہ سجاوندیؒ نے تو وقف کی قسمیں کر کے ان کے لیے رموزِ اوقاف وضع کیے ہیں، گو ان کی اصطلاحات دیگر علماء اوقاف سے مختلف ہیں۔ مگر مفہوم تقریباً ایک ہی ہے۔ اور یہ رموزِ اوقاف جو ملک میں طبع ہونے والے مصاحف میں پائے جاتے ہیں۔ اور علامہ سجاوندیؒ سے پہلے بھی ائمہ اوقاف نے معنی کا لحاظ کرتے ہوئے وقف کی قسمیں کی ہیں اور مواقع وقوف کی پورے قرآن مجید میں تعیین کی ہے۔ اور ان کے لیے احکام بیان کیے ہیں اور اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، مثلاً ایضاح الوقف و الابتداء، للانباری متوفی ۳۲۸ھ۔ الاکتفاء فی معرفة الوقف والابتداء، لابی عمرو الدانی متوفی ۴۴۴ھ۔ الاهتداء فی بیان الوقف والابتداء، للعلامة ابن الجزریؒ۔ منار الهدیٰ فی بیان الوقف والابتدا للاشمونی (یہ کتاب عام دستیاب ہے) المرشد للشیخ زکریا الانصاریؒ یہ کتاب منار الہدیٰ کے حاشیہ پر ہے۔ اور بہت سے حضرات (متقدمین و متاخرین) نے موضوعِ خاص کے طور پر اس علم کی خدمت کی ہے۔

جواب طلب بات یہ ہے کہ علماء اوقاف کا وقف کی قسمیں کرنا اور ان کے لیے رموز وضع کر کے مصاحف میں شامل کرنا اس کی شرعی حیثیت کیا ہے، اور حکم کیا ہے؟

علامہ زرکشی اور علامہ سیوطی نے وقف کی قسمیں، ان کے احکام اور ان کے متعلقات کو بیان کرنے کے بعد اول الذکر نے اپنی البرهان فی علوم القرآن جلد اول صفحہ ۳۵۴ میں اور ثانی الذکر نے الاتقان فی علوم القرآن جلد اول صفحہ ۸۹ میں لکھا ہے۔

وذهب ابو یوسف القاضی صاحب ابی حنیفة الیٰ ان تقدیر الموقوف علیه من القرآن، التام والناقص، والحسن والقبیح وتسمیته بذلك بدعة و متعمد الوقف علی نحوه مبتدع۔ قال: لان القرآن معجز وهو کالقطعة الواحدة، فکله قرآن وبعضه قرآن وکله تام حسن وبعضه تام حسن۔ حکیٰ ذلك ابو القاسم بن برهان النحوی عنه۔

جب یہی بات مولوی حفیظ الدین صاحبؒ اور مولانا سید نذیر حسین صاحبؒ وغیرہ چند اہلِ حدیث حضرات نے کہی تھی کہ علامہ سجاوندی کی مقرر کردہ رموزِ اوقاف اور ان پر وقف کرنا بدعت ہے اور آیات پر وقف کرنا ضروری اور واجب ہے تو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ نے ان کے رد میں رد الطغیان فی اوقاف القرآن کے نام سے کتاب لکھی اور حضرت نے یہ ثابت کیا کہ ان موقعوں پر وقف کرنا خلافِ سنت نہیں ہے۔

قاضی ابو یوسف کی عبارت سے جو تعارض پیدا ہو رہا ہے اس کو حل فرمائیں اور مفصل و مدلل باحوالہ جواب سے مستفید فرما کر شکریہ کا موقع بخشیں۔ فجزاکم اللہ احسن الجزاء فی الدنیا والآخرة۔ والسلام المستفتی

(قاری) جمیل الرحمٰن کراچی

جواب استفتاء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رؤس آیات پر وقف کرنے کو قرآن میں ہمیشہ ہر دور میں ائمہ قرات کے دور سے بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور سے لے کر مابعد کے تمام ادوار میں اَحب اور مستحسن سمجھا گیا، علامہ دانی فرماتے ہیں وَھُوَ اَحَبُّ اِلَیَّ

محلِ بحث یہ ہے کہ کلام اللہ میں جو آیات طویل ہیں مثلاً آیت الدین، ان کو ایک سانس میں پڑھا نہیں جا سکتا ہے اور درمیانِ آیات میں وقف کرنا ایک طبعی ضرورت ہے، اس وقف کے لیے ایسی جگہ پر وقف کر لیا جائے جہاں اعراب کے لحاظ سے فقرہ کسی درجہ میں ہی صحیح مفید للمعنی ہو یہ نہ ہو کہ مضاف پر بغیر مضاف الیہ کے، فعل پر بغیر فاعل کے، مبتدا پر بغیر خبر کے وقف کیا جائے یا مضمونِ جنت کو مضمونِ نار سے ملا دیا جائے، کافروں کے حال کو مؤمنین کے حال پر جوڑ لگا کر اس طرح وقف کیا جائے کہ مؤمنین کافرین پر عطف ہو جائیں۔ کسی کا سانس چھوٹا ہے ایک ایک سطر پر سانس لینے کی ضرورت پڑتی ہے وہ کیا کرے کہاں ٹھہرے؟ اس کا ایک جواب تو تیمار قسم کا یہ ہے کہ ابھی ہمیں کیا کہیں بھی سانس لینے کی ضرورت ہو ٹھہر جاؤ، یعنی وَمَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّا اللّٰہ میں کوئی حرج نہیں کہ وَمَا مِنْ اِلٰہٍ پر وقف کر دے۔ اِنِّیْ کَفَرْتُ بِمَا اَشْرَکْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ میں اِنِّیْ کَفَرْتُ پر وقف کر لے۔ وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ مِنْ قَبْلِکُمْ پر وقف کر دے اور آگے ابتدا کرے وَاِیَّاکُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰہ یعنی پیچھے سے لوٹانا کوئی ضروری نہیں سمجھتا۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں جو کتب اوقاف میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس قسم کے اوقاف سے نہایت قبیح مفہوم یا تفسیر نہ صحیح کم از کم ایہام معنی غیر مراد الٰہی تو پیدا ہو رہا ہے۔ علامہ جزری فرماتے ہیں

ولیس فی القرآن من وقف وجب

ولاحرام غیر ماله سبب،

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن میں کوئی وقف نہیں جس کو واجب کہا جائے اور جہاں نہ ٹھہرنے والے کو گنہگار قرار دیا جائے، اور نہ کوئی وقف حرام ہے کہ وہاں وقف کرنے کی وجہ سے گنہگار ہو جائے۔ ملّا علی قاری فرماتے ہیں "لانهما لا یدلان علی معنی یختل بذهابهما الا ان یکون له سبب یستدعی تحریمه وموجب یقتضی تاثیمه کان یقصد الوقف علی مَا مِنْ اِلٰهٍ و اِنِّی کَفَرْتُ و نحوهما من غیر ضرورة اذ لا یقصد ذلك مسلم واقف علی معناه واذا لم یقصد فلا یحرم علیه لا الوصل ولا الوقف، واما غیر الواقفین علی معناه ففی الامر سعة علیهم اذ لا یتصور القصد لدیهم لکن الاحسن مع عدم القصد ان یجتنب الوقف علی مثل ذالك مطلقًا للایهام علی خلاف المرام۔ منح الفکریه ص ۶۲

ابن الانباری، علامہ سجاوندی یا صاحب منار الہدیٰ یا شیخ الاسلام زکریا الانصاری یا علامہ جزری نے جو مستقل تصانیف فنِ وقف پر تصنیف فرمائیں تو ان تمام اصطلاحات و رموز کا مقصد نہایت نیک اور اعلیٰ ہے کہ قرآن کو تحریف و ایہام سے بچانے کا یہی راستہ ہے کہ عوام الناس کو معانی کے اعتبار سے وقف و وصل کے مواقع کی نش

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا کی تفسیر میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول تقریباً تمام مفسرین محدثین و قراء نے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا

الترتیل هو تجوید الحروف ومعرفة الوقوف۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول کتب احادیث میں مروی ہے۔

لقد عشنا برهة من دهرنا وان احدنا لیوتی الایمان قبل القران فتنزل السورة علی النبی صلی اللہ علیه وسلم فنتعلم حلالها وحرامها وامرها وزجرها وما ینبغی ان یوقف عنده، دونوں آثار اس پر واضح دلالت کرتے ہیں کہ وقف کا تعلم و معرفت ضروری ہے بلکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا لقد عشنا برهة من دهرنا ایک عرصہ ہم پر اس طرح گزرا کہ اوقاف کے مناسب مواقع کو سیکھنے میں گزارتے تھے۔ اگر اوقاف سے اس جگہ رؤس الآیات مراد ہیں تو ان کو سیکھنے اور یاد کر لینے میں لمبی مدت تک تعلم و معرفت کی کیا حاجت تھی، وہ باآسانی ایک بچہ کو بھی یاد کرائے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ علامہ جزری فرماتے ہیں:

ففی کلام علی رضی اللہ عنه دلیل علی وجوب تعلمه ومعرفته۔ وفی کلام ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنهما برهان علی ان تعلمه اجماع من الصحابة رضی اللہ عنهم وصح بل تواتر عندنا تعلمه والاعتناء به من السلف الصالح۔

وقال الامام ابو زکریا الوقف فی الصدر الاول من الصحابة والتابعین وسائر العلماء مرغوب فیه من مشائخ القراء والائمة الفضلاء مطلوب فیما سلف

من الانصار، واردة به الاخبار الثابتة والآثار الصحيحة۔ (منح الفكريه لملا علی قاری)

آپ اس موضوع پر پائی جانے والی بڑی مستند اور محققانہ کتابوں کا حوالہ دے رہے ہیں مثلاً ایضاح الوقف والابتداء (للانباری) الاکتفاء فی معرفۃ الوقف والابتداء (لابی عمرو الدانی) الاہتدا فی بیان الوقف والابتدا (للعلامہ ابن الجزری) منار الہدی (للاشمونی)، المرشد لشیخ زکریا الانصاری۔ ماشاء اللہ یہ وسیع مطالعہ قابلِ ستائش ہے۔ مگر آپ کا یہ تحریر فرمانا کہ "جواب طلب بات یہ ہے کہ علماء کا وقفات کا وقف کی قسمیں کرنا اور ان کے لیے رموز وضع کر کے مصاحف میں شامل کرنا اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟" حالانکہ انہیں کتابوں کے مبسوط اوراق میں اوقاف کی شرعی حیثیت پر بڑی ٹھوس اور گرانقدر بحثیں پھیلی ہوئی ہیں، جن کو یہاں نقل کرنا چنداں ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ خیر اب پھر ذرا اصل بحث پر توجہ فرمائیں۔

"رؤس آیات ہی پر وقف کرے، درمیان میں نہ ٹھہرے" ہماری اوپر والی معروضات سے واضح ہو گیا ہو گا کہ یہ فیصلہ سراسر ناانصافی پر مبنی ہے، اس پر عمل تو شاید جبرئیل علیہ السلام ہی کر سکیں، کیونکہ ان ہی کو درمیانِ آیت میں سانس لینے کی ضرورت نہیں ہو سکتی لیکن انسان چھوٹے سانس والا، دمہ کا مریض جو ایک ایک لفظ پڑھے اور ٹھہرے، اٹک اٹک کر پڑھنے والا وغیرہ بڑی بڑی آیات کو ایک سانس میں نہیں پڑھ سکتا تو اس مسافر کو ضرورت ہے کہ درمیانِ آیت میں ٹھہرنے کے مواقع کی آپ رہنمائی فرمائیں۔ علامہ دانی کی معرفۃ الوقف والابتداء میں ملاحظہ فرمائیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک خطیب کھڑا ہوا فتشهد وقال من يطع الله ورسوله فقد رشد ومن يعصهما، ووقف، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم قم بئس الخطيب انت قال بعضهم انما كان ذلك لقبح لفظه وكان حقه ان يقف على رشد او على غوى او يصل الجميع۔ غور فرمائیں کہ غلط جگہ پر وقف کی وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسی ناگواری ہوئی حالانکہ نیت اس کی خیر ہی تھی شر نہ تھی۔"

مسئلہ مبحوث فیہا میں ایک اور زاویہ سے بھی رائے قائم کی جاتی ہے، اور اس رائے کی بنیاد حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا والی مشہور روایت کو بنایا گیا ہے، مسئلہ کا متن یوں ہے کہ "رؤس الآیات پر ضرور ٹھہرے، رؤس الآیات پر نہ ٹھہرنا بلکہ وصل کر کے پڑھنا خلافِ سنت ہے۔"

اس مسئلہ کا یہ مطلب ہو گا کہ پورے قرآن مجید میں چھ ہزار سے اوپر آیاتِ شریفہ ہیں تو چھ ہزار سے اوپر آیات کی تعداد کے مطابق وقف بھی کرے۔ چھوٹی چھوٹی آیات ہوں مثلاً والضحیٰ ۞ والليل اذا سجیٰ ۞ وغیرہ تو خواہ موقعہ ترتیل ہو یا تدویر یا حدر، آیات پر ضرور ٹھہرے، ضرور سانس لے، کیونکہ وقف سانس لے کر ٹھہرنے ہی کو کہتے ہیں کما ہو متفق علیہ۔

یہ اوقات حافظ کے لیے خصوصاً حدر پڑھنے والے کے لیے تراویح یا غیر تراویح میں ایک عملِ ثقیل ہو کر رہ جائے گا۔

ذرا اسی طرح مکی سورتوں کو رواں تلاوت فرما کر دیکھ لیجیے۔

بہر حال اس عمل کی دشواری سے قطع نظر اس کی دلیل یہ بیان فرمائی جاتی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم رؤس آیات پر ضرور وقف فرماتے تھے جیسا کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے سورۃ فاتحہ میں مروی ہے۔ یہ استدلال اس طرح غلط ثابت ہوتا ہے کہ قراءتِ سبعہ کا فن جو متواتر اور مسلّمہ ہے اس میں اختلافِ قراءت متعدد جگہ رؤسِ آیات میں بھی واقع ہے وہ اختلاف اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتا کہ رأس الآیت پر وصل نہ کیا جائے۔ مثلاً سورۃ بروج کے آخر میں بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ لفظ محفوظ جو رأسِ آیت ہے اس میں دو متواتر قراءتیں ہیں، رفع کے ساتھ محفوظٌ، اور جر کے ساتھ محفوظٍ، تفہیم کے لیے یہ ایک مثال کافی سمجھی گئی ورنہ اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ سوال یہ ہے اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ آیات پر وقف فرماتے تھے تو محفوظ کی ظا ساکن ہی پڑھتے ہوں گے پھر رفع اور جر کی قراءت جو یقیناً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تلاوت فرمانے سے لی گئی ہے خیالی احتمالات پر مبنی نہیں، یہ قراءت کا اختلاف کیسے ہوا، اس کا حل سوائے اس کے کچھ نہیں کہ آیات پر آپ نے وصل بھی فرمایا ہے اور وصل میں کبھی رفع اور کبھی جر پڑھا ہے۔

غرض نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ درمیانِ آیات میں وقف نہیں اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ رؤسِ آیات پر وصل کرنا خلافِ سنت ہے۔

کتبِ قراءت میں کلماتِ قرآنیہ پر ائمہ قراءت کے اختلاف مروی ہیں اور یہ تمام کلمات تقریباً درمیانِ آیات ہیں، اگر درمیانِ آیات وقف خلافِ سنت تھا تو یہ سارا باب بیکار ہے

اس سادی لسادسی کو الٹ کر یوں نہیں کہہ دیا جاتا کہ یہ تمام بحث ہی ائمہ قرارت کی بے اصل ہے۔ یہ الفاظ آپ کو معلوم ہے کہ کبرت کلمۃ تخرج من افوٰھھم ان یقولون الا کذبا کے مصداق ہوں گے۔ معاملہ ائمہ قرارات کا ہے۔ آپ نے یہ بحث ضرور سنی ہوں کہ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ علماء و اکابر کی دو رائے ہیں۔ حضرتِ ابن عباس، حضرتِ عائشہ، حضرت ابن مسعود وغیرہ رضی اللہ عنہم کی رائے میں اِلَّا اللّٰہ پر وقف ہونا چاہیے۔ یعنی وقفِ لازم ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور اکثر اہلِ علم رحمہم اللہ کا مذہب ہے فراء، اخفش اور ابوحاتم وغیرہم کی بھی یہی رائے ہے یعنی راسخین فی العلم تاویل کو نہیں جانتے لیکن وہ کہتے ہیں آمنا بہ، اور کچھ حضرات کے بیان پر وقف نہیں ان کے نزدیک وَالرّٰسِخُوْنَ لفظ اللّٰہ پر عطف ہے۔ اس کو ابن حاجب اور ان کے متبعین نے اختیار کیا ہے۔

اس بحث سے یہ ثابت ہوا کہ درمیانِ آیات پر وقف اور عدم وقف پر بحث کا وجود ہے۔

اسی طرح حفصؒ، امام القراءۃ عاصم کوفیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ قرآن میں چار جگہ سکتہ ہے، سورۂ کہف کے شروع میں عِوَجًا پر، دوسرا سورۂ یٰسین میں مِنْ مَّرْقَدِنَا پر، تیسرا سورۂ قیامہ میں مَنْ سکتہ رَاقٍ پر، چوتھا مطففین میں بَلْ سکتہ رَانَ پر، اولین پر التباس معنوی سے بچنے کے لیے اور ثانیین پر التباس لفظی سے کہ صیغہ مبالغہ مَرَّاقٍ یا بَرَّانَ نہ سمجھا جائے سکتہ کیا گیا، سکتہ ایک گونہ وقف ہی کی قسم ہے۔

وقفِ لازم یا وقفِ تام کافی کو بھی اسی پر قیاس کر لیجیے۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ عربی سمجھنے والے حضرات کو قرونِ اولیٰ میں اس بحث کی چنداں ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ وہ خود بہتر جگہ پر وقف کے اہل تھے اس فن کی، فنِ تجوید کی طرح اہلِ عجم کے لیے ضرورت پڑی جو معانی سے بالکل ناواقف تھے، لہٰذا رموز مقرر کیے گئے، جس کو متقدمین و متاخرین میں سے کسی نے بھی بدعت نہیں کہا۔

حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا قول تقدیر الموقوف علیہ من القرآن التام والناقص والحسن والقبیح و تسمیتہ بدعۃ الخ البرہان للزرکشی جلد اول صفحہ ۳۵۲ پر شاید ہو یہ کتاب ہمارے پاس موجود نہیں لیکن الاتقان للسیوطی میں جلد اول صفحہ ۸۹ پر یا سیاق و سباق میں دور کہیں اس قول کا وجود نہیں ہے تعجب ہے آپ نے کہاں سے یہ بات اتقان کے حوالے سے نقل کی۔ بہرحال یہ قول منار الہدیٰ للاشمونی میں شروع ہی میں درج ہے۔ جس کی اشمونی نے تردید کی ہے ہمیں اس قول پر بوجوہ کلام ہے۔

(۱) قاضی صاحب رحمہ اللہ کے دور تک اوقاف کی یہ قسمیں یعنی تام ناقص بایں مصطلح خاص وجود ہی میں نہیں آئی تھیں، یہ قول تو وہ کہہ سکتا ہے جو قاضی صاحبؒ کے دور کے دو، ڈھائی سو سال بعد ہوا ہو، ایک مشہور حقیقت ہے کہ قرنِ اول میں اور قرنِ ثانی میں اصطلاحات فنون وجود میں نہ آئی تھیں۔ امام ابو یوسفؒ متوفی ربیع الاول ۱۸۲ھ۔ ائمہ اوقاف کے سنین وفات آپ نے خود ہی لکھے ہیں۔

(۲) اس قول کے ناقل ابوالقاسم بن برہان نحوی ہیں، کتب مذہب یا شارحین مذہب حنفی کی کتابوں میں اس قول کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔

(۳) قاضی صاحبؒ کی طرف اس قول کا انتساب اس وجہ سے بھی مشکوک ہے کہ خود حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف بعض اقوال منسوب ہوئے مثلاً یہ کہ امام صاحبؒ نے پڑھا ہے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ (برفع الجلالہ ونصب العلماء) علامہ جزریؒ فرماتے ہیں۔

القراءۃ المنسوبۃ الی الامام ابی حنیفۃ رحمہ اللہ التی جمعھا ابو الفضل محمد بن جعفر الخزاعی ونقلھا عنہ ابو القاسم الھذلی وغیرہ، فانھا لا اصل لھا، قال ابو العلاء الواسطی ان الخزاعی وضع کتابا فی الحروف نسبہ الی ابی حنیفۃ فاخذت خط الدار القطنی وجماعۃ، ان الکتاب موضوع لا اصل لہ۔

قلت وقد رویت الکتاب المذکور ومنہ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء برفع الھاء ونصب الھمزۃ۔ وقد راج ذلک علی اکثر المفسرین ونسبھا الیہ وتکلف فی توجیھھا، وان ابا حنیفۃ لبریٔ منھا۔

النشر فی القراءات العشر
ج اول ص۱۲

(۴) کو خد وغیرہ میں بعض غیر محقق لوگوں کا وقف کے باب میں قاضی صاحبؒ سے یہاں تک غلو پایا ہو کہ وہ وقف قبیح وغیرہ کی صورتوں میں فساد صلوۃ یا گنہگار ہونے کا حکم لگانے لگے ہوں، چنانچہ شارح المنیہ فرماتے ہیں

عامۃ المشائخ قالوا لا تفسد الصلوٰۃ فی الاوقاف القبیحۃ لعموم البلوٰی فی انقطاع النفس والنسیان

چنانچہ کتب فقہ میں یہ بات درج ہے کہ نمازی میں کسی خاص حصہ قرآن کو پڑھنے کے لیے مخصوص کر لینا کہ اسی کو پڑھے اور دوسرے کسی مقام سے بالکل نہ پڑھے، بدعت کہا ہے اور تقریباً یہی الفاظ مروی ہیں کہ لان القرآن معجز وھو کالقطعۃ الواحدۃ فکلہ قرآن و بعضہ قرآن۔ ظاہر تر یہ ہے کہ اسی قول کو کسی نے کھینچ تان کر اوقاف کی مجوزہ اصطلاحات کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

"بہرحال اگر کچھ لوگوں نے امام ابو یوسف صاحبؒ پر تجہم اور ارجاء کی تہمت لگائی تو صرف اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں ورنہ امام صاحبؒ کی ذات گرامی اس قسم کے اتہامات سے بری تھی۔"

(آثار امام محمد وابو یوسف۔ از رئیس احمد جعفری ص ۵۰۸)

(۵) بالفرض اگر قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ نے یہ فرمایا بھی ہے کہ تعدیل الموقوف علیہ عن القرآن التام والناقص الخ اس سے صرف اوقاف کی تقسیم تام ناقص کی اصطلاحات کا بدعت ہونا مفہوم ہوتا ہے مگر یہ قول اس سے خاموش ہے کہ آیات پر وقف ہونا چاہیے اور اس سے بھی خاموش ہے کہ رؤس آیات پر وصل کر کے پڑھنا خلاف سنت ہے۔ مولوی حفیظ الدین صاحب اور مولانا سید نذیر حسین صاحب وغیرہ ہمہ اہل حدیث نے یہ دونوں باتیں کہی ہیں۔ تو پھر قاضی صاحبؒ اور موخر الذکر دونوں بزرگ ایک دوسرے کے ہمرائے کیسے ہوئے؟ اور قول مذکور سے یہ مفہوم کہاں سے اور کس طرح پیدا ہوا کہ آیات ہی پر وقف کرنا ضروری اور واجب ہے۔ بات کو اس کے موقف میں منحصر رکھتے ہوئے صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت قاضی صاحبؒ ان اصطلاحات کو ناپسند فرماتے ہیں۔ بس اتنی سی حقیقت پر قاضی صاحب کی بات ختم ہو جاتی ہے، اس کو مولانا سید نذیر حسین کی رائے سے ہم معنی اور مرادف ٹھہرانا، غلو زیادتی ہے۔

بقیہ : مساجد کا کردار

سب سے بڑا مرکز تھا دنیا کا سب سے بڑا علمی مرکز بھی بن گیا۔ نظامیہ بغداد اس وقت دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی یہ یونیورسٹی ایک مسجد سے ملحق تھی بالفاظ دیگر مسجد ہی کے ایک حصے میں درس و تدریس کا یہ اہم ادارہ قائم تھا جس میں علامہ ابن جوزی، امام غزالی، امام ابو اسحاق، ابن رشد، الکندی، عبدالکریم جیلی، فارابی، امام فخرالدین رازی اور ذکریا رازی جیسے استاد درس دیتے تھے اور دنیا کا کوئی علم ایسا نہ تھا جو یہاں نہ پڑھایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ تمام اسلامی ممالک میں درسگاہوں کا جال بچھا ہوا تھا جگہ جگہ لائبریریاں اور کتب خانے قائم تھے۔ کتابیں نقل کرنے کے لئے سرکاری طور پر قلم، دوات اور کاغذ مہیا کئے جاتے تھے۔ اس طرح یہ دور علوم و فنون کی ترقی اور نشر و اشاعت کے لحاظ سے سنہری دور کہلاتا ہے۔

دعا کی درخواست

حضرت الامام لاہوری قدس سرہٗ کے دیرینہ خادم اور کالعدم مجلس احرار اسلام کے مخلص کارکن حاجی برکت علی صاحب کو گذشتہ دنوں پے در پے حوادث سے دوچار ہونا پڑا۔ جس میں دکان کی وہ چوری بھی شامل ہے جس میں کم و بیش ۳۰/۳۵ ہزار کا نقصان ہوا۔ افسوس کہ ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ بہرحال حاجی صاحب موصوف صبر و شکر سے وقت گذار رہے ہیں۔ اور برادران طریقت اور مخلص مسلمانوں سے دعا کے ملتجی ہیں ــــ اللہ تعالیٰ سب پر اپنا کرم فرمائے۔ (ادارہ)

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ۔

(الحدید ۱۴)

تم جہاں بھی جاتے ہو میں تمہارے ساتھ ساتھ ہوتا ہوں

شمعِ قرآنی

حافظ محمد ظہور الحق ظہور

خدائے مہرباں کا آخری پیغام ہے قرآں
غلامانِ محمدؐ کیلئے انعام ہے قرآں

یہ وہ نعمت ہے قاسم جس کے محبوبِ خدا آئے
یہ وہ کوثر ہے ساقی جس کے ختم الانبیاء آئے

یہ وہ نسخہ ہے جس سے مُردہ قومیں زندگی پائیں
دلوں میں جس سے نور آئے نگاہیں روشنی پائیں

ھُدًی لِلنّاس قرآنِ مبیں، نورِ خدا کہیے
اسے تنزیلِ ربّ العالمین، جامِ صفا کہیے

بدل دیتا ہے یہ بغض و عداوت کو محبت سے
ضعیفی بزدلی کو، استقامت سے، شجاعت سے

یہی منہاجِ سنت، جادۂ حق، راہِ جنت ہے
یہی عینِ ہدایت ہے، یہی گنجِ سعادت ہے

غذائے روحِ مومن، داروئے دردِ مسلماں ہے
یہی دُنیا کی دولت ہے، یہی عقبیٰ کا ساماں ہے

یہی وہ ذکر ہے جس کی حفاظت حق نے فرمائی
یہی وہ نور ہے جس سے جہاں میں روشنی آئی

اسی بارانِ رحمت سے گلستاں میں بہار آئی
یہی قرآن بن کر نصرتِ پروردگار آئی

یہ منشورِ محمدؐ ہے یہ ہے دستورِ ربانی
اسی پر دو جہاں میں ہے فلاحِ نوعِ انسانی

جو بزمِ زندگی میں شمعِ قرآنی جلائے گا
وہی دُنیا و عقبیٰ میں ظہور آرام پائے گا

از ڈاکٹر سید عبد اللہ

حضرت مولانا

میں ۱۹۲۰ء میں تعلیم کے لیے لاہور آیا۔ میرے چچا صاحب جن کے سایۂ عاطفت میں تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ ملا، ہر روز صبح کے وقت مولانا احمد علی صاحب کے درس قرآن میں شریک ہوتے تھے۔ مجھے بھی اپنے ہمراہ لے جاتے تھے۔

کھدر کے لباس میں ملبوس، لمبا کرتا، اونچی شلوار، سر پر کلاہ کی ٹوپی، یا کبھی کبھی عمامہ۔ لانبا قد، چوڑے شانے، جسم گٹھا ہوا۔ داڑھی جو بعد میں بہت لمبی ہو گئی تھی، اس زمانے میں مناسب حد تک بڑھی ہوئی، قد و قامت رعب دار، رنگ سانولا، مگر چہرے پر بڑی نورانی کیفیت۔ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ دیکھنے والا متاثر یا مرعوب نہ ہو۔ بات میں نرمی و شفقت، مگر جب جذبے میں آتے تو آواز گرجدار ہو جاتی۔

یہ تھے حضرت مولانا احمد علی صاحب جن سے میں لڑکپن میں روشناس ہوا اور آخری دم تک عقیدت کم نہ ہونے پائی۔

حضرت مولانا، علما کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کے ہاتھ میں قرآن و حدیث، دل میں جذبۂ جہاد ——— ان بزرگوں کی پیروی کی آرزو رکھتے تھے جو باطل کے مقابلے میں ہمیشہ تیغ بدست رہے۔ یہ سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے جا ملتا ہے۔ جن کے خانوادے کے فیض تربیت سے جہاد کا فریضہ ادا کرنے والے علما کبھی سرحد پر جا کر جمے اور کبھی بنگال میں صف آرا ہوئے، کبھی سکھوں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنے، کبھی انگریزوں کے مورچوں میں کھلبلی مچا دی۔ غرض حضرت مولانا انھیں مجاہدین صف شکن کے وارث اور پیرو تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی اس صدی کے بلند پایہ دینی مفکرین میں سے تھے۔ مولانا احمد علی ان کے شاگردان خاص میں سے تھے۔ میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں، اس زمانے میں تو وہ ہندوستان سے باہر تھے، مگر مولانا احمد علی کی صورت میں ان کے افکار کی نمائندگی یہاں برابر ہوتی رہی۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے دہلی میں جنگ عظیم اول سے قبل ایک ادارہ نظارۃ المعارف قائم کیا تھا۔ اس کے تین بڑے مرکز توجہ تھے۔

اوّل: درس قرآن و حدیث

دوم: شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیمات کی نشر و اشاعت

سوم: برطانوی استعمار کی مخالفت اور آزادی پسند گروہوں سے تعاون

مولانا احمد علی صاحب نے مرکز لاہور میں بیٹھ کر ان ہی تینوں اہم مقاصد کی پیش رفت میں عمر صرف کی۔

حضرت مولانا شاید مولانا سندھی کے زیر اثر ہمیشہ نئی تعلیم یافتہ جماعت کی تربیت پر نظر رکھتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کے خیالات اس گروہ تک پہنچیں۔ انھیں اس گروہ سے بڑی توقعات تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے درس میں شرکت کرنے والوں کی اکثریت اسی جماعت سے متعلق تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس جماعت کے سلسلے میں مولانا جو توقعات رکھتے تھے، وہ کبھی پوری نہ ہوئیں اور نہ ہو سکتی تھیں۔ مگر میں اس وقت اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔

تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ انگریزوں کے خلاف شدید نفرت و حقارت کے جذبات مشتعل ہو چکے تھے اور معاملہ یہاں تک آ گیا کہ غیور مسلمانوں کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ انگریزوں کی غلامی میں ایک دن بھی سرزمین ہند میں بسر کریں۔ ہجرت کا فیصلہ ہوا اور ہجرت کرنے والوں میں حضرت مولانا بھی تھے۔ لاہور سے جب ان کا قافلہ ریل میں رخصت ہوا، تو لاکھوں آدمی اسٹیشن پر موجود تھے اور جب اس قافلے نے سرحد پار کی تو لاکھوں آدمی ترک وطن کر چکے تھے۔

افغانستان اس قافلے کی منزل تھی ...... مگر کیا منزل تھی؟ اسلام کی حالت زبوں، دین کی صورت مسخ، وہی حالت ہوئی کہ

غربت جب کہ راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا۔

ادھر انگریزوں کے زر خرید مسلمانوں نے وسوسہ انگیزیاں کیں اور کہا کہ یہ لوگ ہندوؤں کے لیے سب کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ یہ ہندوؤں کی چال ہے۔ انگریزوں کے بہی خواہوں میں سر اور خان بہادر انگریز کے کسی ظلم کو ظلم نہ سمجھتے تھے۔ لیکن آزادی کی صفوں میں رخنہ ڈالنے کے لیے ذرا ذرا سی بات کر کر اور طعنیان کہ یہ مسلمانوں کو جنگ آزادی سے روکتے تھے۔ ہمارے ملک میں ایک سال سے یہ دستے بہت کامیاب رہے ہیں۔ [illegible] صدی سے مسلمانوں کی واحد قدر نفع پرستی ہے۔ یہ انگریزی تعلیم والوں کی واحد

ستان اور واحد عقیدہ ہے ۔ اور اب تو ساری قوم اس میں شریک ہے ۔ اسلام کے ہر عقیدے کو اسی فلسفے کے کلہاڑے سے فنا کیا گیا ۔ تمام دنیاوی حب سب کچھ ٹھہری تو پھر اسلام کے لیے سرفروشی اور قرآن و سنت کے لیے جان گدازی کون کرے گا ؟

بہر صورت ہجرت ناکام ہوئی اور حضرت مولانا بھی لعبد حسرت و یاس اپنے مرکز میں واپس آ گئے ۔ اور اسی دارالحرب میں رہ کر ، کام کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ۔

قبلہ نے واپس آکر درس و تدریس کے ان قدیم سلسلوں کو پھر زندہ کیا ۔ اس مرتبہ میں نے صحیح مسلم اور حجۃ اللہ البالغہ کے درس میں شرکت کی ۔ میں زیادہ شعور نہ رکھتا تھا ۔ مگر یہ بات میرے ذہن نشین ہو جاتی تھی کہ رسول مقبول صلعم کے سب اقوال حکمت اور معقولیت سے مرکب ہیں اور دین کے سب احکام ہر زمانہ میں قابل عمل ہیں ۔ بشرطیکہ ہر زمانہ میں ، اس کی ہدایات کے مطابق زمانے کی تعبیر و توجیہہ کی جائے ۔

میں ۱۹۲۶ء کے بعد انگریزی تعلیم کے دائرے میں داخل ہو گیا ۔ فارسی کا ایم ۔ اے کر چکا تھا اور مزید تعلیم کی آرزو تھی ۔ بڑا مقصد یہ تھا کہ اپنے لیے مناسب ذریعہ معاش پیدا کر سکوں ۔ پھر یہ بھی خیال تھا کہ انگریزی تعلیم کے طلسم کدے میں جو کچھ ہے ۔ اُسے بھی اندر سے دیکھ سکوں اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضرت مولانا نے کبھی میری حوصلہ شکنی نہیں کی ۔ پہلے تو اس پر تعجب رہا ۔ مگر ایک واقعہ کے بعد وہ تعجب جاتا رہا ۔

میں نے جامعہ ملیہ سے واپس آکر داڑھی بڑھالی تھی ۔ یہ سلسلہ بڑے عرصے تک رہا ۔ تا آنکہ کالے بالوں کے اندر سفید بال (میرے خیال میں قبل از وقت) نکل آئے ۔ جوانی کے ان دشمنوں کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا ۔ میں نے بھی ان کا منہ کالا کرنے کی کوشش کی ۔ مگر یہ دشمن بڑے سخت جان تھے ۔ جھٹ سیاہی کو دھو کر اپنا سفید منہ پھر دکھا دیتے تھے ۔ کوئی اچھا سمجھے یا بُرا ۔ میں نے بڑھاپے کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا ۔ اگرچہ ننگ پیری ہے جوانی میری ۔ پھر بھی جوانی کا محض خیال بھی بڑا ہی حیات بخش خیال ہے ۔ آخر ایک دن سلیفٹی ریزر سے کالے چٹے بال سفید کر دیئے ۔

واقعہ سخت تھا ۔ خصوصاً میرے لیے کیونکہ علما کے حلقوں سے متوسل تھا ۔ سب سے زیادہ اذیت یہ تھی کہ اپنے والد ماجد اور اپنے استاذ مکرم حضرت ۔ ۔ ۔ کو کس طرح منہ دکھاؤں گا ۔ چنانچہ عرصہ دراز تک چھپنے چھپانے کی کوشش کی ۔ والد صاحب وطن میں تھے ۔ اس ۔ ۔ ۔ آسانی رہی ۔ مگر حضرت مولانا ؟ وہ تو یہیں تھے ۔ خبریں پہنچیں بلکہ پہنچائی گئیں ۔ میری طلبی ہوئی ۔ میں ٹال گیا ۔ پھر طلبی ہوئی ۔ پھر بہانہ تراش لیا ۔ انھوں نے فراست سے اندازہ کر کے طول نہ دیا ۔ میں سمجھا سب کچھ فراموش ہو گیا اور مسجد شیرانوالہ کو اب میری یاد اور میرا حلیہ تک بھول گیا ہوگا ۔

ایک دن ایک مجلس میں پکڑا گیا ۔ حضرت مولانا دور بیٹھے تھے ۔ اٹھ کر میرے پاس آ گئے ۔ میں نے کہا ، "تنگ آمد و سخت آمد" ۔ مگر نہیں ۔ شفقت سے بھری ہوئی آواز کانوں میں گونجی ۔

"میاں عبداللہ شاہ ! آپ اپنے مرکز سے کٹ گئے ۔ کیا وجہ ؟"

پھر خود ہی کہا ۔

"دیکھیے سپاہی دو قسم کے ہوتے ہیں ۔ ایک باوردی ۔ دوسرے بے وردی ۔"

پھر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا ۔

"ہم باوردی ہیں اور آپ بے وردی اور آج کے دور میں بے وردی سپاہی زیادہ مفید اور کار آمد ہیں ۔ آپ اپنے مرکز کو نہ چھوڑیں ۔ پھر یہ مصرعہ پڑھا ۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

آواز کی نرمی دل کی گہرائیوں میں اتر گئی اور فضائے قلبی میں عجیب قسم کی رقت اور عجب قسم کا سکون محسوس ہوا ۔ سچ کہا اقبال نے :-

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر
شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا !

حضرت مولانا کئی باتوں میں عام علما سے مختلف تھے ۔ انھوں نے بعض رسمیات زندگی ، جدید لوگوں سے اپنائی تھیں ۔ سائیکل کی سواری عموماً وقار عالمانہ کے خلاف سمجھی جاتی ہے ۔ لیکن حضرت مولانا بوقت ضرورت سائیکل سے فائدہ اٹھاتے تھے ۔

وقت کی باقاعدگی میں بے مثال ، ضوابط و آداب میں بے نظیر ، ان میں ڈھیلا پن نام کو بھی نہ تھا ۔ سخت کوشی ، جفا طلبی میں اپنے استاد کے نقش

قدم پر تھے۔ جہاں کے لیے جس قسم کی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے وہ اپنے آپ کو تیار رکھتے تھے۔

حضرت مولانا یوں عقائد میں بڑے پکے تھے۔ مگر مسلمانوں کے اتحاد کے مسئلوں میں، ان کے طریقوں میں بڑی لچک تھی۔ حزب الاحناف کے لوگ انہیں اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ مگر وہ ضروری موقعوں پر مولانا سید دیدار علی شاہ سے بھی جو ان دنوں احناف کے سرخیل تھے۔ مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب پنجاب میں ایک مسلمان وزیر اعظم نے خاکساروں پر ظلم ڈھایا تو حضرت مولانا نے (جو اصلاً احرار کے مسلک کے آدمی تھے) سخت احتجاج کیا۔ ان کی بات [illegible] میں نظر بند کر دیئے گئے۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں محض اس لیے شرکت کرتے تھے کہ یہ انجمن تعلیم کی خادم انجمن ہے۔ اور انجمن کے بعض ارکان [illegible] کسی کو نظر انداز کر دیتے۔

حضرت مولانا نے مسلسل چالیس برس تک قال اللہ وقال الرّسول کی شمع روشن رکھی۔ مطالعۂ قرآن کی تحریک کو تقویت دی۔ علمائے دین کے رموز سے عوام و خواص کو آگاہ کیا — دینی ذوق کے ساتھ مسلمانوں کی آزاد سیاست کو اپنے پرزور خطبات کے ذریعے مستحکم کیا اور یہ سب کچھ ایسے حالات میں کہ عمر بھر بے زری کا شکار رہے۔ مگر فقر و قناعت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

زمانے میں بڑے بڑے لوگ آتے رہیں گے۔ مگر احمد علی کم پیدا ہوں گے۔ خدا تعالیٰ حضرت مولانا کی روح کو آسودہ رکھے اور ان کی برکات کے طفیل ہم پر بھی کرم کرے۔

شارحِ حق، قاطعِ اوہام تھے احمد علیؒ
تیغِ قرآں، خنجرِ اسلام تھے احمد علیؒ

زندگی اُن کی تھی تفسیرِ حیاتِ اولیاءؒ
دینِ فطرت کا حسیں پیغام تھے احمد علیؒ

وہ شریعت کے تھے عالم، اور طریقت کے امام
ساغرِ جم — معرفت کا جام تھے احمد علیؒ

قوم نے اس نعمتِ حق کی نہ کی آزادؔ! قدر
اصل میں — اللہ کا انعام تھے احمد علیؒ

— حکیم آزاد شیرازی

حمد

حافظ عبدالرحمن حافظ
ملتان سے

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدْ — بات ہے سچّی صد فی صد

غفّار و قہّار و صَمَد — میرے مالک میرے آقا!

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ — توحیدِ حقّ باری تعالیٰ

باقی سب باتیں ہیں رَد — اپنی ذات میں تُو سچّا ہے

پیر و جواں اور نیک و بد — بندے سب تیرے ہی ہیں

حافظ بھی ہے رحمت کا طالب

آقا اس کی کرنا مدد

ملفوظات صحابہ کرامؓ

مرسلہ: رستم علی ناصر لاہور

○ سیدنا صدیق اکبرؓ فرماتے ہیں:
اللہ کے بندو! آپس میں قطع تعلق نہ کرو، بغض نہ رکھو، ایک دوسرے پر حسد نہ کرو۔ اور بھائی بھائی بن کر رہو۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے تم کو حکم دیا ہے۔

○ سیدنا فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں:۔
میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جب تک یہ دونوں چیزیں تم میں رہیں گی اس وقت تک بھلائی رہے گی۔
۱۔ فیصلہ میں انصاف
۲۔ تقسیم میں انصاف

امدادالاحکام

تالیف: مولانا ظفر احمد عثمانی رح

قیمت: ساٹھ روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ آپ نے جہاں خود ہر موضوع پر چھوٹی بڑی ہزار سے زائد کتابیں سپرد قلم فرما کر امت کی ہر معاملہ میں رہنمائی کی وہاں اپنے متعلقین میں سے متعدد اصحاب قلم کو مختلف ذمہ داریاں سونپ دیں جس کے نتیجہ میں ایسے ایسے جواہر پارے سامنے آئے کہ سبحان اللہ!

انہی جواہر پاروں میں سے زیر تبصرہ کتاب ہے۔ مرشد تھانوی رح نے از خود جو فتاویٰ تحریر فرمائے وہ امداد الفتاویٰ کے نام سے چھ جلدوں میں ایک عرصہ سے چھپ رہے ہیں۔ اور اللہ کی مخلوق ان سے بے پناہ فائدہ حاصل کر رہی ہے۔ چونکہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں سوالات کی کثرت ہوتی تھی اس لیے آپ نے بعض دوسرے حضرات کو بھی اس کام پر مامور فرما دیا۔

قاعدہ یہ تھا کہ ہر عالم کے فتاویٰ الگ الگ رجسٹروں میں نقل کر کے اصل فتاویٰ متعلقہ حضرات کو ارسال کر دیے جاتے۔ اس طرح تین مجموعے طیار ہو گئے جن کے نام آپ نے امدادالاحکام، امداد المسائل اور جمیل الفتاویٰ تجویز فرمائے۔ اول الذکر مجموعہ ان نادر روزگار فتاویٰ پر مشتمل ہے جن میں سے اکثر آپ کے خواہرزادہ محدث نبیل اور فاضل جلیل مولانا ظفر احمد عثمانی قدس سرہٗ نے سپرد قلم فرمائے۔ جبکہ بعض فتاویٰ مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلوی علیہ الرحمہ نے۔

انیس سال کے عرصہ میں لکھے گئے ان فتاویٰ میں سے اکثر پر حکیم الامت رح کے تصدیقی دستخط ہیں۔ اور جن پر دستخط نہیں وہ بھی آپ کے زبانی مشورہ کے بعد لکھے گئے۔ یہ مکمل مسودہ آٹھ بڑے بڑے رجسٹروں پر مشتمل تھا اور ان میں سے بعض دہلی کے ایک رسالہ النور میں شائع بھی ہوئے۔

حکیم الامت رح کے خاص صاحب تعلق مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ نے آپ کے بھتیجے مولانا شبیر علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے یہ مواد حاصل کر کے اپنی نگرانی میں تبویب و ترتیب کا کام کرایا اور پھر خود ہی ان کی کتابت شروع کرائی۔ افسوس! کہ جب یہ سرمایہ طبع ہو کر سامنے آیا تو مفتی صاحب اور مولانا ظفر احمد صاحب میں سے کوئی بھی دنیا میں نہ تھا لیکن مفتی صاحب علیہ الرحمہ کے فرزندوں نے اس علمی سرمایہ کو اسی آن بان سے دنیا کے سامنے پیش کیا جس کا وہ بجا طور پر مستحق تھا۔

بڑے سائز کے ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل، کتابت و طباعت، کاغذ اور جلد ہر چیز میں نفاست کا اہتمام کیا گیا ہے۔

ہمارے خیال میں یہ ایسا مجموعہ ہے کہ ہر ذی شعور مسلمان کو اسے حاصل کرنا چاہیے، اور اپنی دنیا و آخرت کی بہتری کی خاطر حرزِ جاں بنانا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ حضرت تھانوی ان کے جملہ متعلقین بالخصوص اس کتاب میں کسی طرح بھی کوئی ذمہ داری ۱۲

۱۲ - نبھانے والے سب حضرات پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور اس خدمت کو قبول و منظور فرمائے۔

آقا سے بغاوت کیوں!

رقص و سرود ، راگ و رنگ ناچ گانے ، کھیل تماشے ، ورائٹی شو ، نظریہ پاکستان اور محمدی اسلام سے کھلی بغاوت ہے ۔ وقتی تفریح کے بہانے بے غیرتی کے عارضی سرور اور دولت کے نشہ میں چور ہو کر فتنہ دل و نگاہ کی آگ سے مت کھیلو

فرمانِ باری تعالیٰ ہے :

- اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ ۔
- بیشک جو لوگ ایمانداروں میں بدکاری پھیلانا چاہتے ہیں ان کیلئے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے (سورۃ النور آیۃ ۱۹)
- اور انہیں چھوڑ دو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے اور دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکہ دیا ہے اور انہیں قرآن سے نصیحت کرو تاکہ کوئی اپنے کئے میں گرفتار نہ ہو جائے کہ اس کے لئے اللہ کے سوا کوئی دوست اور سفارش (قبول) کرنے والا نہ ہوگا ۔ اور اگر دنیا بھر کا معاوضہ بھی دے گا تب بھی اس سے نہ لیا جائے گا ۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے کئے میں گرفتار ہوئے اور ان کے پینے کے لئے گرم پانی ہوگا اور ان کے کفر و "انکار" کے بدلے میں دردناک عذاب ہوگا ۔ (سورۃ الانعام آیت ۷۰)
- اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے دولت مندوں کو کوئی حکم دیتے ہیں پھر وہ وہاں نافرمانی کرتے ہیں ، تب ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے اور ہم اسے برباد کر دیتے ہیں ۔ (سورۃ بنی اسرائیل آیۃ ۱۶)
- بے شک کان آنکھ اور دل کے بارے میں باز پرس ہوگی ۔ (سورۃ بنی اسرائیل آیۃ ۳۶)

● علامہ اقبال کا مشہور شعر ہے :

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل؟ دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں ....!

- حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری امت میں بعض لوگ زمین میں غرق ہونگے اور ان کی صورتیں بھی مسخ ہوں گی یہ عذاب تب ہوں گے جب گانے والی عورتیں اور آلات لہو (باجہ وغیرہ) ظاہر ہوں گے
- اور فرمایا گانے اور باجوں سے بچو ۔ میرے رب نے مجھے ہاتھ اور منہ سے بجائے جانے والے (ہر قسم کے) باجوں کو مٹا دینے کا حکم دیا ہے ۔ oooooooooo اور فرمایا :

اللہ تعالیٰ لعنت فرماتا ہے اس شخص پر جو گانے بجانے کا کام کرے یا اپنے گھر میں اس کا اہتمام کرے (حدیث)

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں ★ یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں (اقبال)

خاموش مبلغ

محلہ سادات ۔ ملتان شہر

انجمن خدام الدین لاہور کی طرف سے شائع شدہ

قرآن عزیز

بہ تجشیہ جدیدہ

بہترین عکسی طباعت سے مزین

ترجمہ: شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ

ہدیہ

قسم اعلیٰ: -/۲۰۰ روپے ، کاغذ آسٹریا ، وہائٹ پرنٹنگ ، چرمی جلد

قسم اول: -/۷۵ روپے امپورٹڈ آفسٹ پیپر

قسم دوم: -/۳۵ روپے جلد ڈائی دار کاغذ میکینیکل گلیزڈ

قسم سوم: -/۲۱ روپے جلد سادہ کاغذ میکینیکل گلیزڈ

محصول ڈاک: -/۶ روپے

فی نسخہ زائد ہوگا۔

بہ اہتمام ناظم شعبہ تالیف و اشاعت انجمن خدام الدین دروازہ شیرانوالہ لاہور